قومی زبان

بیادِ علامہ اقبال

خصوصی شمارہ

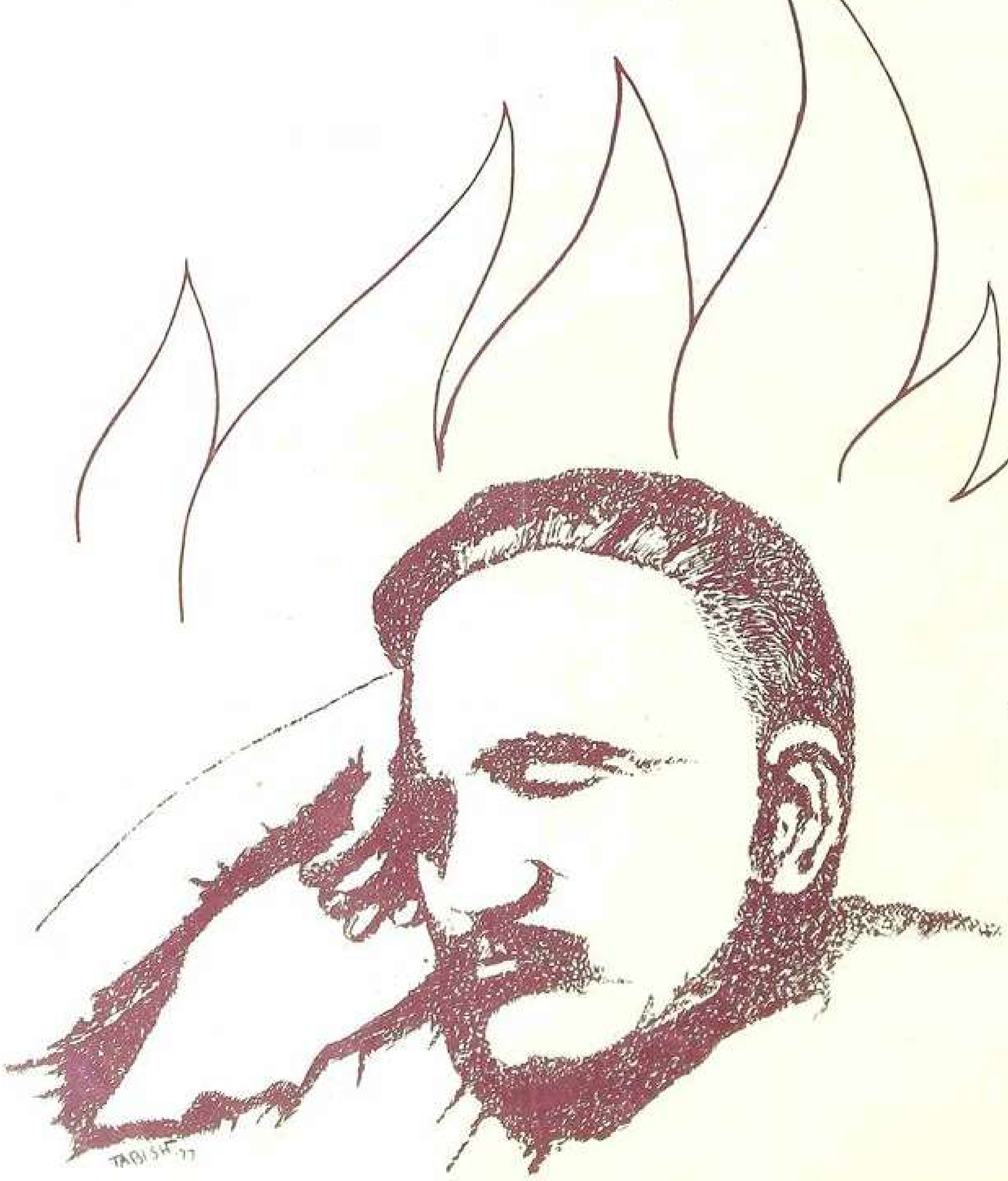

فاش گویم بتو حرفے کہ ندانند ہمہ کس

Golden Jubilee of National Bank of Pakistan

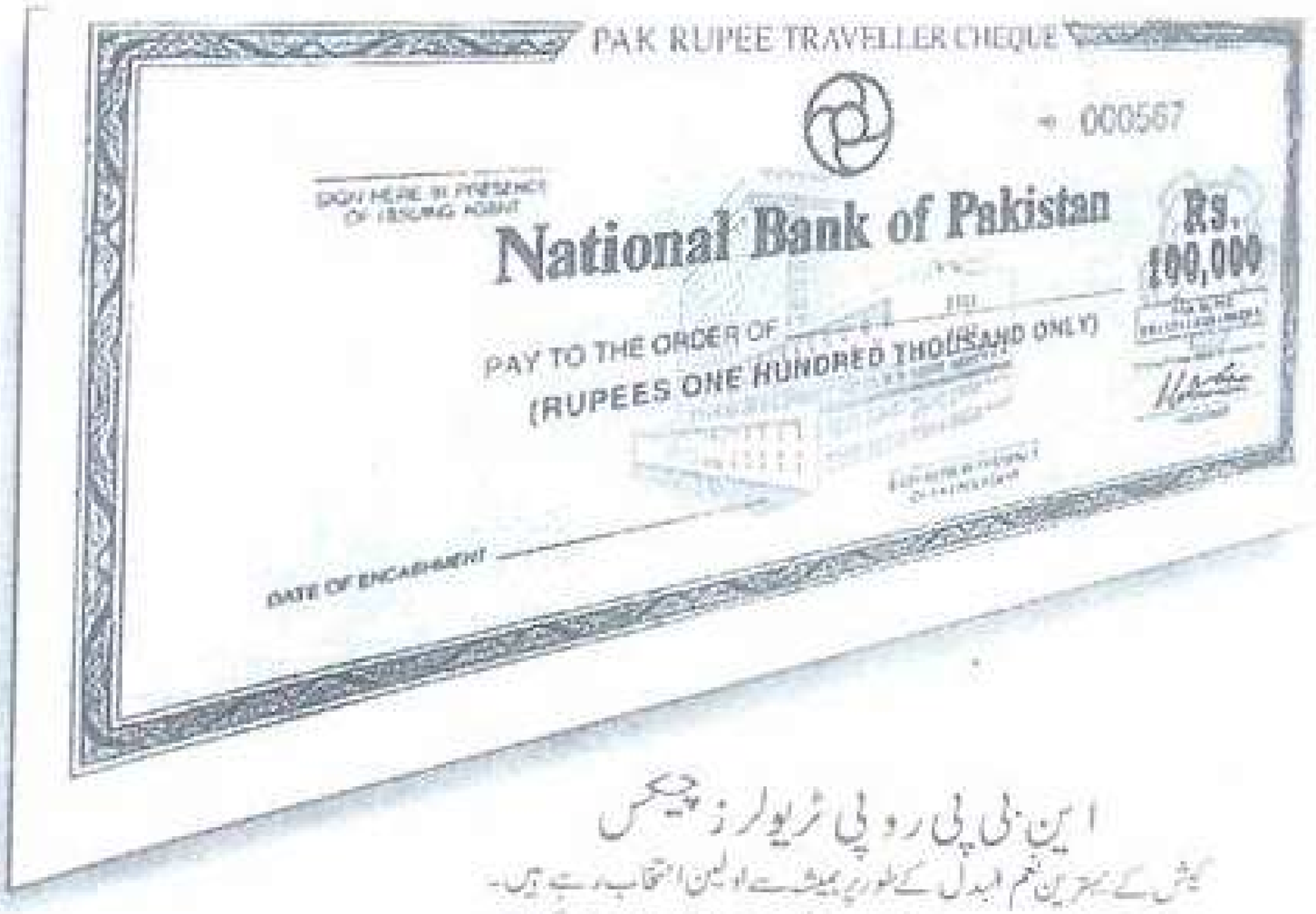

این بی پی
روپی ٹریولرز چیکس
حفاظت بھی
سہولت بھی

این بی پی روپی ٹریولرز چیکس
کیش کے بہترین نعم البدل کے طور پر ہمیشہ سے اولین انتخاب رہے ہیں۔
آپ خواہ سفر پر جا رہے ہوں یا کاروباری لین دین اور خریداری وغیرہ کیلئے،

این بی پی روپی ٹریولرز چیکس
رقم کی باحفاظت منتقلی کی ضمانت ہیں۔

این بی پی روپی ٹریولرز چیکس
کا انتخاب قومی خدمت کے لئے کوشاں نیشنل بینک پر آپ کے اعتماد کے اظہار کے ساتھ ساتھ
آپ کی رقم کے مکمل تحفظ اور ذہنی اطمینان اور سکون کی ضمانت بھی ہے۔

این بی پی روپی ٹریولرز چیکس، تحفظ اور سہولت کی دیرینہ روایت

این بی پی روپی ٹریولرز چیکس
درج ذیل مالیتوں میں
دستیاب ہیں

5,000	روپے
10,000	روپے
50,000	روپے اور
100,000	روپے

نیشنل بینک آف پاکستان
خدمت، اعتماد اور تحفظ کی علامت

ARGUS

ننو بیر احمد علوی

ماھنامہ

قومی زبان

کراچی

بانی: بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

قومی زبان اپریل ۲۰۰۱ء، جلد: ۷۳، شمارہ: ۴

جاری شدہ: پاکستان میں ۱۹۴۸ء

مضمون نما

توقیتِ اقبال	جگن ناتھ آزاد	۵
اقبال کے غیر مطبوعہ خطوط بنام مس ویگے ناسٹ	ڈاکٹر سعید اختر درانی	۱۴
اقبال کیسا نظامِ حکومت چاہتے تھے؟	ڈاکٹر عبد الغفار کوکب	۴۳
اکیسویں صدی اور پیغامِ اقبال	ڈاکٹر مس عصمت ناز	۵۱
علامہ اقبال اور مسلم نشاۃ ثانیہ	نسیم نیشوفوز	۶۱
اقبال اور اردو	فلک شیر لیل	۶۵
اقبال کا مردِ مومن	صادق حسین طارق	۷۲
گزشتہ سال جدا ہوگئے ہم سے یہ لوگ...	شمیم صبائی متھراوی	۷۵
رفتارِ ادب	...	۸۴
گرد و پیش	...	۹۱

ادارۂ تحریر

ادا جعفری

جمیل الدین عالی

مشفق خواجہ

مدیر

ادیب سہیل

بدلِ اشتراک

فی پرچہ ــــــ ۱۰ روپے

سالانہ عام ڈاک سے ــ ۱۱۰ روپے

سالانہ رجسٹری سے ــ ۲۳۰ روپے

بیرونِ ملک

سالانہ عام ڈاک سے ۱۰ پونڈ/۱۵ ڈالر

سالانہ ہوائی ڈاک سے ۱۵ پونڈ/۲۵ ڈالر

انجمن ترقی اُردو پاکستان

شعبۂ تحقیق

ڈی-۱۵۹، بلاک ۷، گلشنِ اقبال

کراچی ۷۵۳۰۰

فون: ۰۶ ۱۴ ۴۶۱ - ۴۹۷۳۲۹۶

تازگی کا احساس، رُوح افزا کی اساس

تاثیر بے مثال، ذائقہ لاجواب

گئی صدی سے نئی صدی تک ۔ ایک ہی مشروب، ایک ہی نام

رُوح افزا راحتِ جاں

مدینۃ الحکمۃ تعلیم سائنس اور ثقافت کا عالمی منصوبہ۔

آپ ہمدرد دوست ہیں۔ اعتماد کے ساتھ مصنوعاتِ ہمدرد خریدتے ہیں۔ جائز منافع بین الاقوامی شہر علم و حکمت کی تعمیر میں لگ رہا ہے۔ اس کی تعمیر میں آپ بھی شریک ہیں۔

ہمدرد کے متعلق مزید معلومات کے لیے ویب سائٹ ملاحظہ کیجیے۔

www.hamdard.com.pk

ہمدرد

Adarts-HRA-2/2000 (R)

بیسویں صدی گزر چکی اور ہم اکیسویں صدی میں داخل ہو چکے ہیں۔ بیسویں صدی کے بہت سے ادھورے کام اس صدی میں مکمل ہونے ہیں۔ اس طرح گزشتہ صدی نو آمدہ صدی میں سانس لے رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نئی صدی کی آمد کے ساتھ اس کا رشتہ معاً گزشتہ صدی سے منقطع نہیں ہو جاتا۔ یہ رشتہ جاری و ساری رہتا ہے۔ اسی رشتے کے تحت ماضی، حال اور مستقبل ایک دوسرے سے جڑے رہتے ہیں، اور ایک دوسرے کے کام آتے رہتے ہیں۔ دراصل تینوں ہی زمانے ایک دائرے میں بندھے ہوئے ہیں یہ تسلسل ابتدائے آفرینش سے قائم ہے اور ابد تک جاتا ہے۔

علامہ اقبال کا انتقال ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو ہوا تھا، جس کو تقریباً ۶۵ سال کا عرصہ ہوتا ہے۔ اس وقت ہم نئی صدی کے ماہ اپریل میں سانس لے رہے ہیں، جو اس صدی کے حوالے سے علامہ کی پہلی برسی کا مہینہ ہے، اس موقع پر اندرون ملک اور بیرون ملک علامہ کی یاد میں مختلف قسم کی تقاریب منعقد کی جاتی ہیں ادبی سیمینار کا اہتمام ہوتا ہے اہلِ دانش سے علامہ پر مضامین پڑھوائے جاتے ہیں، اقبال اکیڈمی اور اسی نوع کے دوسرے ادبی ادارے علامہ کی یاد میں جلسے منعقد کرتے ہیں، اخبارات و جرائد خصوصی نمبر اور گوشہ ترتیب دیتے ہیں۔

ماہنامہ ''قومی زبان'' بھی اس روایت کی پاسداری کرتے ہوئے ہر سال پابندی سے علامہ کی برسی اور سالگرہ کے مہینوں: اپریل اور نومبر میں علامہ سے متعلق خصوصی گوشہ یا خاص نمبر چھاپتا ہے۔ قلمی معاونین سے ان نمبروں کے لیے قلمی معاونت کی درخواست کی جاتی ہے۔ ان کے تعاون سے قومی زبان ایک اچھا نمبر یا گوشہ شائع کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اپریل کا یہ شمارہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ چناں چہ اس بار بھی آپ کئی لحاظ سے اس میں شامل مضامین میں علامہ کے حوالے سے انفرادیت کی جھلک پائیں گے۔

کمرشل بینکاری سے متعلق آپ کی تمام تر ضروریات کو پیشہ ورانہ طور پر پورا کرنے کیلئے مصروفِ عمل

آئی ڈی بی پی

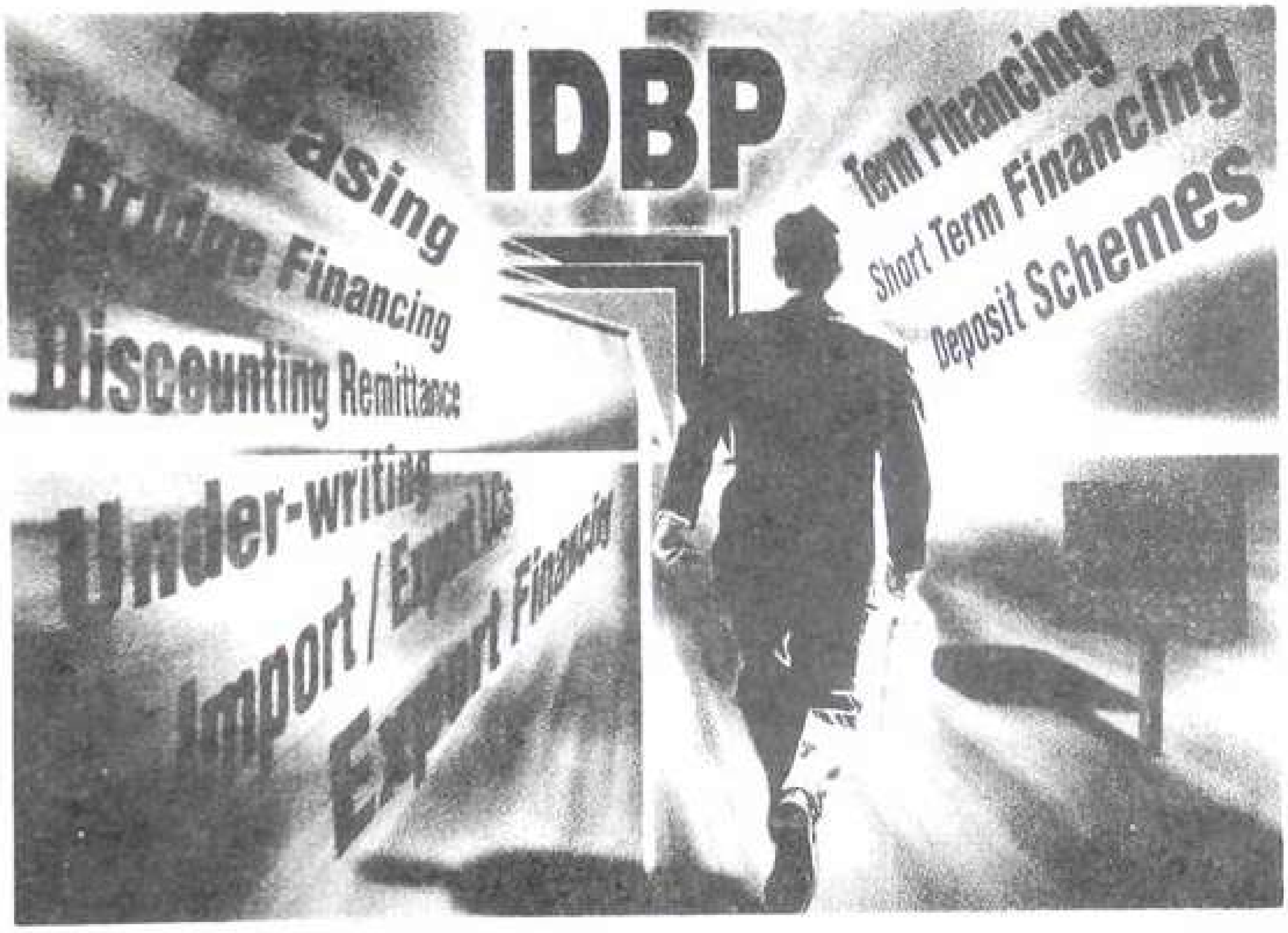

آپ کی ضروریات پوری کرنے کیلئے خصوصی طور پر وضع کی گئی منافع بخش بچت اسکیموں سمیت
کمرشل بینکاری کی وسیع تر خدمات کیلئے انڈسٹریل ڈویلپمنٹ بینک آف پاکستان آپ کا منتظر ہے۔

IDBP
— bank on the move
Industrial Development Bank of Pakistan

ہیڈ آفس: اسٹیٹ لائف بلڈنگ نمبر2، آف آئی آئی چندریگر روڈ، پوسٹ بکس نمبر5082 کراچی فون: (92-21) 2419160-68, 2419171, 2412190
گرامز: INDEBA, Karachi ٹیلیکس: 20722 IDBP PK. فیکس: (92-21) 2411990 E-mail: idbp@idbp.com.pk Website: www.idbp.com.pk

توقیتِ اقبال

جگن ناتھ آزاد
صدر انجمن ترقی اردو (ہند)

شمار	واقعہ	مقام	تاریخ	کیفیت
۱	ولادت	سیالکوٹ	جمعہ، ۹ نومبر ۱۸۷۷ء	
۲	مڈل	اسکاچ مشن ہائی اسکول، سیالکوٹ	۱۸۹۱ء	
۳	میٹریکولیشن	اسکاچ مشن ہائی اسکول، سیالکوٹ	۱۸۹۳ء	امتیازی حیثیت سے پاس کیا، تمغہ اور وظیفہ پایا۔
۴	انٹرمیڈیٹ	اسکاچ مشن ہائی اسکول، سیالکوٹ	۱۸۹۵ء	
۵	بی۔اے میں داخلہ	گورنمنٹ کالج، لاہور	۱۸۹۵ء	
۶	پہلی بار مشاعرے میں شرکت	لاہور	۱۸۹۶ء	
۷	بی۔اے	گورنمنٹ کالج، لاہور	۱۸۹۷ء	عربی میں یونی ورسٹی بھر میں اول آئے اور ''جمال الدین طلائی تمغہ'' انعام میں ملا۔
۸	ایم۔اے (فلسفہ)	گورنمنٹ کالج، لاہور	۱۸۹۹ء	پنجاب بھر میں اول آئے ''نانک شاہ تمغہ'' انعام میں ملا۔
۹	میکلوڈ عربک ریڈر	اورینٹل کالج، لاہور	۱۸۹۹ء	

۱۰	''نالۂ یتیم'' انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسے میں پڑھی۔	۱۹۰۰ء	یہ انجمن حمایت اسلام کا پندرہواں سالانہ اجلاس تھا جو ۲۳، ۲۴ اور ۲۵ فروری ۱۹۰۰ء کو منعقد ہوا۔ یہ نظم ۲۴ فروری کے تیسرے اجلاس میں بعد نمازِ عصر پڑھی گئی۔ شمس العلما مولانا نذیر احمد خاں اس اجلاس کے صدر تھے۔ (مولانا عبدالمجید سالک اور عبداللہ انور بیگ نے اس اجلاس کی تاریخ ۱۸۹۹ء لکھی ہے۔ جو صحیح نہیں۔
۱۱	قیام بھاٹی دروازہ، لاہور	۱۹۰۰ء تا ۱۹۰۵ء	
۱۲	''یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے'' لاہور انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں پڑھی۔	۱۹۰۱ء	مولانا عبدالمجید سالک نے ''ذکرِ اقبال'' میں اس نظم کا ذکر کرتے ہوئے یہ شعر نقل کیا ہے: پیامِ عیش و مسرت ہمیں سناتا ہے ہلال عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے دراصل یہ شعر اقبال کی ایک بہت بعد کی نظم کا ہے اور اس کا عنوان ہے۔ ''عید پر شعر لکھنے کی فرمائش کے جواب میں'' یہ نظم ۱۹۱۲ء کی ہے۔ مذکورہ جلسے میں اقبال نے جو نظم پڑھی تھی اس کا پہلا شعر یہ ہے: اے مہِ عید بے حجاب ہے تو حسنِ خورشید کا جواب ہے تو

۱۳	”اشکِ خوں“ (ملکہ وکٹوریہ کا مرثیہ جو فی البدیہہ کہا)	لاہور	۱۹۰۱ء	۲۲ جنوری کو کہا اور مسلمانوں کے اس جلسے میں پڑھا جو ملکہ وکٹوریہ کی وفات پر ۲۳ یا ۲۴ جنوری کو منعقد ہوا۔
۱۴	ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کا امتحان۔	لاہور	۱۹۰۱ء	
۱۵	”اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے“	لاہور	۱۹۰۲ء	انجمن حمایت اسلام کے سترھویں سالانہ اجلاس میں ۲۳ فروری کے دوسرے جلسے میں پڑھی۔ میاں نظام الدین جلسے کے صدر تھے۔
۱۶	”ابرِ گہربار“ (فریادِ امت)	لاہور	۱۹۰۳ء	انجمن حمایت اسلام کے اٹھارویں سالانہ اجلاس میں ظہر اور عصر کے درمیان پڑھی۔ خان بہادر غلام احمد مشیر مال ریاست جموں و کشمیر جلسے کے صدر تھے۔
۱۷	اسسٹنٹ پروفیسر	گورنمنٹ کالج، لاہور	۱۹۰۳ء	
۱۸	”علم الاقتصاد“ کی اشاعت	لاہور	۱۹۰۳ء	علامہ اقبال کی سب سے پہلی تصنیف
۱۹	نظم ”سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا“ کی تخلیق		۱۰/اگست ۱۹۰۴ء	
۲۰	حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ دہلی کے مزار پر حاضری		۱۹۰۵ء	
۲۱	روانگی	انگلستان	۱۹۰۵ء	
۲۲	پی۔ایچ۔ڈی	میونخ یونی ورسٹی جرمنی	۱۹۰۷ء	
۲۳	عربی کے پروفیسر	لندن، یونی ورسٹی	۱۹۰۷ء۔۱۹۰۸ء	
۲۴	Development of Metaphysics in Persia کی اشاعت	لندن	۱۹۰۸ء	

۲۵	بار ایٹ لاء	لندن	۱۹۰۸ء
۲۶	ہندوستان واپس ہوئے	لندن سے	۱۹۰۸ء ۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء کو لاہور پہنچے۔
۲۷	مدتِ قیام	انار کلی، لاہور	اکتوبر ۱۹۰۸ء تا ۱۹۲۱ء
۲۸	بیرسٹری کی ابتدا	لاہور میں	۲۲/اکتوبر ۱۹۰۸ء
۲۹	چیف کورٹ میں پریکٹس کرنے کی درخواست	لاہور	۲۴/اکتوبر ۱۹۰۸ء
۳۰	"شکوہ" انجمن حمایت اسلام لاہور کے اجلاس میں		۱۹۱۱ء
۳۱	فلسفہ کے پروفیسر	گورنمنٹ کالج، لاہور	۱۹۱۱ء
۳۲	علامہ اقبال نے اپنے استاد سید میر حسن کے پوتے سید محمد عبداللہ کو ان کے اصرار پر اپنے اشعار سنائے۔	انار کلی، لاہور	۱۹۱۳ء علامہ اپنا کلام سنانے سے ہمیشہ گریز کرتے تھے۔ انجمن حمایتِ اسلام کے جلسوں کے علاوہ انھوں نے بہت کم اپنا کلام دوسرے جلسوں میں پڑھا یا کسی کو سنایا۔
۳۳	تاریخ ہند (مڈل کلاس کے لیے)	لاہور	۱۹۱۳ء اس کا خلاصہ جو امرت سر کے ایک ناشر نے ۱۹۱۴ء میں شائع کیا۔ جناب ممتاز حسن کی ذاتی لائبریری میں ان کے انتقال کے وقت تک محفوظ تھا۔ اصل کتاب نایاب ہے۔
۳۴	محترمہ امام بی بی والدۂ اقبال کا انتقال	سیالکوٹ	۹/نومبر ۱۹۱۴ء مادرِ مخدومہ اقبال رفت سوئے جنت زیں جہانِ بے ثبات گفت اکبر بادلِ پُر درد و غم رحلتِ مخدومہ تاریخِ وفات ۱۳۲۳ھ

(اکبر)

۳۵	"اسرارِ خودی" کی اشاعت	لاہور	۱۹۱۵ء
۳۶	دردِ گردہ کا پہلا حملہ	لاہور	۸ جولائی ۱۹۱۶ء (مکتوب بنام نیاز الدین خاں) "تین روزے رکھے تھے کہ دردِ گردہ کے دورہ کی ابتدا محسوس ہوئی۔ دو روز سے روزہ سے بھی محروم ہوں۔"
۳۷	"رموزِ بے خودی" کی اشاعت	لاہور	۱۹۱۸ء
۳۸	اپنے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کو لاہور سے ایک اہم خط		۱۹۲۰ء "میری تحقیق کے مطابق ہمارے خاندان کی سکونت "لوچر" یا "لوجر" میں نہیں، موضع چکو پرگنہ آدون میں تھی۔" (اقبال)
۳۹	"اسرارِ خودی" کا انگریزی لندن ترجمہ، از آر۔اے نکلسن		۱۹۲۰ء
۴۰	کشمیر کا سفر	سری نگری	جون ۱۹۲۱ء نشاط باغ میں اپنی مشہور فارسی نظم "ساقی نامہ" کہی۔
۴۱	مدتِ قیام	میکلوڈ روڈ، لاہور	۱۹۲۲ء تا ۱۹۳۵ء
۴۲	"سر" کا خطاب	لاہور	یکم جنوری ۱۹۲۳ء
۴۳	"پیامِ مشرق" کی اشاعت	لاہور	۱۹۲۳ء
۴۴	اسکولوں کے چھٹے، ساتویں اور آٹھویں درجے کے طلبہ کے لیے تعلیمی نصاب (اردو کورس) کی ترتیب۔	لاہور	۱۹۲۴ء ان کتابوں کی ترتیب میں حکیم احمد شجاع نے علامہ اقبال کا ہاتھ بٹایا۔
۴۵	"بانگِ درا" کی اشاعت	لاہور	مارچ ۱۹۲۴ء
۴۶	والدۂ آفتاب اقبال مختار بیگم کا انتقال		۲۱/اکتوبر ۱۹۲۴ء
۴۷	ولادت جاوید اقبال	لاہور	۱۹۲۴ء

۴۸	لیکچر بہ عنوان "اسلام اور اجتہاد"	اسلامیہ کالج، لاہور	۱۹۲۵ء	اس لیکچر کے دوران میں علامہ اقبال نے بڑے جوش کے ساتھ ترکی شاعر ضیا کا کلام سنایا۔
۴۹	پنجاب لجسلیٹو کونسل میں کامیابی	لاہور	دسمبر ۱۹۲۶ء	
۵۰	کونسل کی مدتِ رکنیت	لاہور	۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۹ء تک	
۵۱	"زبورِ عجم" کی اشاعت	لاہور	۱۹۲۷ء	اگر ہے ذوق تو خلوت میں پڑھ "زبورِ عجم" فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں (اقبال)
۵۲	دردِ گردہ کا دوسرا حملہ	لاہور	۱۹۲۸ء	یہ حملہ بہت شدید تھا۔ کانگریس کے مشہور لیڈر لالہ لاجپت رائے علامہ کی عیادت کو آئے تو انھیں مشورہ دیا کہ آپ حکیم نابینا صاحب (حکیم عبدالوہاب انصاری برادر ڈاکٹر انصاری) سے علاج کرائیں۔ چناں چہ علامہ بغرض علاج دہلی تشریف لے گئے۔
۵۳	Reconstruction of Religious Thought in Islam پر لیکچر	مدراس	۱۹۲۸ء	دراصل اس وقت تک لیکچروں کی تعداد تین تھی۔ مدراس، میسور اور حیدرآباد میں (تینوں جگہ) یہی تین لیکچر دیے گئے بعد میں مزید تین لیکچروں کا اضافہ ہوا اور کتاب مدتوں تک Six Lectures کے نام سے مشہور رہی۔ اب نئے ایڈیشن میں لیکچروں کی تعداد سات ہے۔ لیکن اس کتاب کے اکثر وبیشتر شائقین اسے ابھی تک Six Lectures ہی کہتے ہیں اور Six Lectures کے نام سے اس کتاب کا حوالہ دیتے ہیں۔

۵۴	سفر دکن اور مندرجہ بالا لیکچر	میسور	۱۰ جنوری ۱۹۲۹ء	مہاراجہ صاحب میسور کی ذاتی دعوت پر
۵۵	سفر دکن اور مندرجہ بالا لیکچر	حیدر آباد	۱۴ جنوری ۱۹۲۹ء	
۵۶	مولوی میر حسن کا انتقال	سیالکوٹ	۲۵ ستمبر ۱۹۲۹ء	مجھے اقبال اس سید کے گھر سے فیض پہنچا ہے پلے جو اس کے دامن میں وہی کچھ بن کے نکلے ہیں (اقبال)
۵۷	ولادتِ منیرہ	لاہور	۱۹۳۰ء	
۵۸	آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ جلسے کی صدارت	الہٰ آباد	۱۹۳۰ء	
۵۹	شیخ نور محمد (والد علامہ اقبال) کا انتقال	سیالکوٹ	۱۷ اگست ۱۹۳۰ء	پدر و مرشد اقبال ازیں عالم رفت ماہمہ راہرواں منزل ما ملکِ ابد ہاتف از حضرت حق خواست دو تاریخِ رحیل آمد آواز "اثر رحمت" و "آغوش لحد" ۱۳۴۹ھ ۱۳۴۹ھ (اقبال)
۶۰	اقبال نے پروفیسر یوسف سلیم چشتی کو "گلشن راز جدید" سبقاً سبقاً پڑھائی۔	لاہور	۱۹۳۱ء	
۶۱	Reconstruction of Religious Thought in Islam کی اشاعت	لاہور	۱۹۳۱ء	
۶۲	دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت	لندن	۷ ستمبر سے یکم دسمبر ۱۹۳۱ء	۳۰ دسمبر ۱۹۳۱ء کو لاہور واپس پہنچے۔ اس سفر میں غلام رسول مہر اقبال کے ہمراہ تھے۔
۶۳	موتمر عالمِ اسلامی میں شرکت	یروشلم، فلسطین	۱۹۳۱ء	
۶۴	تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت	لندن	۱۷ نومبر سے ۲۴ دسمبر ۱۹۳۲ء تک	تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن جاتے ہوئے۔

۶۵ نپولین کے مزار پر	پیرس	۱۹۳۲ء	
۶۶ مشہور ریسرچ اسکالر مسینون سے ملاقات	پیرس	۱۹۳۲ء	
۶۷ مس فرکوہرسن سے ملاقات	پیرس	۱۹۳۲ء	
۶۸ برگساں سے ملاقات	پیرس	۱۹۳۲ء	اقبال نے برگساں کو رسولؐ کی یہ حدیث سنائی: لاَ تَسبُو الدّھرَ فاَنّ الدّھرَ ھُوُ اللّٰہ، "Do not villify time, for time God" تو برگساں تصورِ زماں کے بارے میں یہ نظریہ دیکھ کر حیران وششدر رہ گیا۔
۶۹ نظم "دعا" کی تخلیق۔	مسجد قرطبہ، اسپین	۱۹۳۳ء	
۷۰ نظم "مسجد قرطبہ" کی تخلیق	اسپین	۱۹۳۳ء	
۷۱ مسولینی سے ملاقات	روم (اٹلی)	۱۹۳۳ء	
۷۲ پروفیسر آسن سے ملاقات	میڈرڈ (اسپین)	۱۹۳۳ء	
۷۳ لیکچر	میڈرڈ یونی ورسٹی میڈرڈ (اسپین)	۱۹۳۳ء	
۷۴ جاوید نامہ کی اشاعت	لاہور	۱۹۳۲ء	۱۹۳۳ء کے شروع میں منظر عام پر آئی
۷۵ علالت کا آغاز	لاہور	۱۹۳۳ء	
۷۶ سفر افغانستان		اکتوبر ۱۹۳۳ء	حکومتِ افغانستان کی دعوت پر۔
۷۷ ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری	پنجاب یونی ورسٹی، لاہور	۴ دسمبر ۱۹۳۳ء	
۷۸ عید کی نماز کے بعد گرم سویاں دہی میں ملا کر کھائیں، شدید نزلے اور کھانسی میں مبتلا ہو گئے، گلا بھی بیٹھ گیا۔	لاہور	جنوری ۱۹۳۴ء	
۷۹ والدۂ جاوید سردار بیگم کا انتقال	لاہور	جنوری ۱۹۳۴ء	

۸۰	"بالِ جبریل" کی اشاعت	لاہور	۱۹۳۵ء
۸۱	مولانا حالی کی برسی میں شرکت	پانی پت	اکتوبر ۱۹۳۵ء
۸۲	سر راس مسعود کے یہاں قیام	بھوپال	۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۸ء تک متعدد بار
۸۳	برقی علاج	بھوپال	۱۹۳۵ء
۸۴	وصیت نامہ کی تحریر	لاہور	۱۹۳۵ء
۸۵	"ضربِ کلیم" کی اشاعت	لاہور	اپریل ۱۹۳۶ء
۸۶	"پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" کی اشاعت	لاہور	ستمبر ۱۹۳۶ء
۸۷	ضیق النفس کی شکایت	لاہور	۱۹۳۶ء کے آخر میں
۸۸	نادرہ مسعود کی پیدائش پر بھوپال تاریخی قطعہ		یکم مارچ ۱۹۲۷ء
۸۹	موتیابند کی شکایت	لاہور	۱۹۳۷ء
۹۰	جامعہ ازہر کے علما کی اقبال سے ملاقات	لاہور	۱۹۳۷ء
۹۱	حکیم نابینا صاحب کا علاج	دہلی	اپریل ۱۹۳۷ء
۹۲	دردِ نقرس کی ابتدا	لاہور	۱۹۳۷ء
۹۳	مدت قیام	جاوید منزل، میوروڈ، لاہور	۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۸ء
۹۴	جواہر لال نہرو اور اقبال کی ملاقات	لاہور	جنوری ۱۹۳۸ء
۹۵	دمہ کے شدید دورے	لاہور	۱۹۳۸ء کے شروع میں
۹۶	دردِ گردہ کا تیسرا حملہ	لاہور	۱۹۳۸ء
۹۷	وفات	لاہور	۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء
۹۸	"ارمغانِ حجاز" کی اشاعت	لاہور	۱۹۳۸ء علامہ اقبال کے انتقال کے بعد

(بہ شکریہ "مرقع اقبال"، مرتبہ جگن ناتھ آزاد)

اقبال کے غیر مطبوعہ خطوط بنام مس ویگے ناسٹ

(۱۹۰۷ء تا ۱۹۳۳ء)

ڈاکٹر سعید اختر دُرانی

ماخذِ خطوط۔ جناب امان اللہ ہوبوہم۔ (سفارت خانۂ البانیہ۔ لندن) حرف آغاز۔

میں نے ان خطوط کے بارے میں ایک ابتدائی اطلاع پہلے پہل جناب صہبا لکھنوی، مدیر "افکار" کو جنوری ۱۹۸۲ء میں دی تھی، جو انھوں نے "افکار" (مارچ ۱۹۸۲ء، ص ۹۶-۹۵) میں ایک خط کے طور پر شائع کر دی تھی۔ اس کے بعد اسی سلسلے میں جناب محمد امان اللہ ہربرٹ ہوبوہم (Herr M.A.H.Hobohm) کی تقریر کا میرا کیا ہوا ترجمہ "محمد اقبال اور جرمنی۔ نامہ و پیام دل کا" کے عنوان سے "افکار" (نومبر ۱۹۸۲ء، ص ۴۲-۱۷) میں چھپ چکا ہے۔(۱) ان دو مضامین سے ان اہم خطوط کے پس منظر پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔

جناب ہوبوہم نے محولہ بالا تقریر، School of Oriental and African Studies, London (SOAS) کے زیر اہتمام منعقدہ یومِ اقبال بروز ۵ مئی ۱۹۸۲ء کے موقعے پر کی تھی، مس ویگے ناسٹ کے نام اقبال کے خطوط کی اشاعت کا اہتمام متذکرہ ادارہ کر رہا ہے، لیکن شائقین اقبال کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کے پیشِ نظر میں ان خطوط کا اردو ترجمہ شائع کرنے کا فخر حاصل کر رہا ہوں۔

جناب امان اللہ ہوبوہم صاحب سے جون ۱۹۸۲ء میں یہ طے پایا تھا، کہ وہ اور میں مل کر علامہ اقبال کے جرمنی کے قیام، اور بالخصوص مس ویگے ناسٹ کے ساتھ اُن کی طویل خط و کتابت کے پس منظر پر، ایک سیر حاصل مقالہ لکھ کر (مع ان تمام خطوط کے اصل مسوّدوں کے عکوس کے مفصّل کتابی صورت میں شائع کریں گے۔ اس میں مکمل حوالوں اور تعلیقات و تصریحات کا اہتمام ہوگا، لیکن ہم دونوں کی گوناگوں مصروفیات کے سبب تاحال اس منصوبے پر عمل درآمد نہیں ہو سکا۔ چنانچہ اولین مرحلے کے طور سے جناب ہوبوہم صاحب کی اجازت سے میں ان خطوط کا ترجمہ شائع کر رہا ہوں۔

ان غیر مطبوعہ خطوط کے پس منظر کی طرف یہاں صرف ایک دو مختصر اشارے کافی ہوں گے۔ جیسا کہ جناب ہوبوہم نے اپنے مضمون "نامہ و پیام دل کا" میں بیان کیا ہے، اس مجموعۂ خطوط کا کھوج جناب ممتاز حسن مرحوم (جو پاکستان جرمن فورم کے صدر بھی تھے) اور جناب ہوبوہم نے (جو اس ادارے کے معتمد عمومی تھے) موسم گرما ۱۹۵۹ء کے دورۂ جرمنی کے دوران لگایا تھا۔ ان خطوط کی مکتوب الیہا، ہائیڈل برگ میں اقبال کے مختصر قیام (اواخر جولائی تا اوائل اکتوبر ۱۹۰۷ء کے دوران اُن کی جرمن زبان کی اتالیق، مس ایما ویگے ناسٹ (Fraulein=Miss) Emma Wegenast تھیں، جن کی طرف ان اصحاب کی توجہ بیگم عطیہ فیضی کی

کتاب (Iqbal's letter to Attiya Begum) کے ذریعے مبذول ہوئی تھی۔ اگرچہ ۱۹۵۹ء کے اس دورۂ جرمنی کے دوران جناب ممتاز حسن اور جناب ہوبوہم مس ویگے ناسٹ سے ذاتی طور سے نہ مل سکے، تاہم اس دورے کے بعد جناب ممتاز حسن نے مس ویگے ناسٹ کے ساتھ خط و کتابت کی، جس کے نتیجے میں خاتون موصوفہ نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ قبل، یعنی ۱۹۶۰ء کی دہائی کے اوائل میں، اپنے نام اقبال کے سارے خطوط پاکستان جرمن فورم کے حوالے کر دیے اور ساتھ ہی یہ درخواست کی کہ انھیں کسی ایسے تاریخی محافظ خانے (Archives) تک پہنچا دیا جائے، جہاں علامہ کی زندگی اور اُن کے کلام پر تحقیقات کرنے والے افراد اُن سے بہرہ یاب ہو سکیں۔ لیکن تاحال ایسا نہیں ہو سکا، چنانچہ موجودہ ترجمے کی اشاعت مکتوب الیہا کی آخری خواہشات کی تکمیل کا مترادف سمجھی جا سکتی ہے۔

چناں چہ ہوبوہم نے اپنی تقریر میں (دیکھیے اس کتاب میں: "محمد اقبال اور جرمنی" ص ۱۰۲-۸۵ بیان کیا ہے ممتاز حسن نے بہ کمال تلطف اس مجموعۂ خطوط کی ایک مکمل فوٹو کاپی اُن کے لیے تیار کروائی تھی، اور اس کے ساتھ ساتھ اُن میں سے دو خطوں کا اصل مسودہ بھی ہوبوہم صاحب کو عطا کر دیا تھا۔ جناب ہوبوہم کے پاس اس وقت جو خط موجود ہیں، وہ دو پوسٹ کارڈوں کو ملا کر تعداد میں کل ستائیس ہیں، بقول اُن کے عین ممکن ہے کہ پچھلے اٹھارہ بیس برسوں میں، ان کی نقلِ مکانی کے سبب جو کئی ایک سفر انھوں نے مختلف براعظموں کے درمیان کیے تھے، اُن کے دوران اس مجموعے کی چند فوٹو کاپیاں گم ہو گئی ہوں۔ انھیں کچھ ہلکی سی یاد یوں آتی ہے کہ کل ملا کر چالیس خطوط تھے، (۲) اور اس کے علاوہ کچھ تصویریں بھی تھیں۔

ان خطوط کی موجودگی کی اطلاع مجھے پہلے پہل ۱۹۶۸ء میں اُس وقت ملی جب میرے ایک کزن کیپٹن (اب کرنل) اسد درانی نے، جو جرمنی میں اُن دنوں ایک اسٹاف کورس کر رہے تھے، برمنگھم میں ایک ملاقات کے دوران مجھے بتایا کہ جرمنی میں وہ ایک نو مسلم جناب ہوبرٹ امان اللہ ہوبوہم صاحب سے کئی دفعہ مل چکے ہیں، جو اُس سے پہلے پاکستان جرمن فورم کے ساتھ وابستہ تھے، اور اب جرمنی میں Rothenburg ob der Tauber کے خوبصورت مقام پر گوئٹے انسٹی ٹیوٹ میں جرمن زبان کی تعلیم دے رہے تھے۔ جہاں میرے کزن بھی اُن کے ایک طالب علم تھے۔ جناب موصوف کی بیگم ایک پاکستانی خاتون تھیں (علامہ اقبال کے دوست مولوی انشا اللہ ایڈیٹر "وطن" کی پوتی اور جناب شیخ عظیم اللہ کی صاحبزادی، جن کا ۱۹۷۵ء میں انتقال ہو گیا ہے)، تو جناب اسد درانی نے ۱۹۶۸ء میں مجھے بتایا کہ جناب ہوبوہم کے پاس علامہ اقبال کے چند خطوط موجود ہیں، جو انھوں نے اپنی جرمن اُستانی کو لکھے تھے۔

پھر یہ بات آئی گئی ہو گئی۔ ۱۹۷۷ء میں جب میں نے عطیہ بیگم کی کتاب ("اقبال" مترجمہ عبدالعزیز خالد) پڑھی، اور اس میں مس ویگے ناسٹ کا مفصل ذکر پایا، اور پھر انھی دنوں فقیر سید وحیدالدین کی کتاب Iqbal in Pictures دیکھنے کا اتفاق ہوا، جس میں مس ویگے ناسٹ کے نام اقبال کے ایک پوسٹ کارڈ (زیر نظر مجموعے کا خط نمبر ۴، مورخہ لندن ۱۶ نومبر ۱۹۰۷ء) کا عکس بھی شامل تھا، تو میرے ذہن میں ان خطوط کی یاد تازہ ہو گئی۔

اس سلسلے کی آخری کڑی یہ ہے کہ کرسمس ۱۹۸۱ء کی تعطیلات میں کرنل اسد درانی جرمنی سے ہمارے یہاں آئے (وہ آج کل بون میں پاکستانی سفارت خانے میں ملٹری اتاشی ہیں) تو انھوں نے بتایا کہ ہوبوہم صاحب جرمن سفارت خانہ لندن میں نائب اتاشی برائے تجارت ہیں، اور عنقریب اُن سے لندن میں ان کی ملاقات ہو گی۔ میں نے اُن سے درخواست کی کہ وہ مجھے بھی ہوبوہم صاحب سے ملائیں۔ چنانچہ یہ ملاقات ۲ جنوری ۱۹۸۲ء کو جناب ہوبوہم کے دولت خانے پر ہوئی، جہاں اُنھوں نے کرنل اور بیگم اسد درانی (یعنی میری ہمشیرہ رخشندہ درانی) کو اور مجھے چائے پر مدعو کیا تھا۔ اس ملاقات میں جناب ہوبوہم نے مجھے علامہ کے وہ خطوط دکھائے،

جن کا اصل مسوّدہ ان کے پاس محفوظ تھا۔ میں نے ان خطوط کی اہمیت اُن پر جتائی اور کہا کہ ان خطوط کی اشاعت بے حد ضروری ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مرورِ زمانہ سے تلف ہو جائیں۔ میں نے کہا کہ عطیہ فیضی بھی تیس پینتیس سال تک اپنے نام اقبال کے خطوط کو پردۂ حجاب میں رکھے رہیں۔ لیکن بالآخر جب انھوں نے یہ خطوط، اور ان کے ساتھ اپنی ڈائری سے پس منظر کے اقتباسات شائع کیے تو اس سے حیاتِ اقبال کے بعض ایسے اہم گوشے منظرِ عام پر آئے، جو اس سے پیشتر پوشیدہ تھے۔ اسی طرح یہ بھی بہت ضروری ہے کہ مس ویگے ناسٹ کے نام اُن کے خطوط شائع کیے جائیں۔ (جناب ہوبوہم سے میری ملاقات کا مختصر حال "افکار" (مارچ ۱۹۸۲ء) میں میرے مذکورہ بالا خط میں شائع ہو چکا ہے)۔

مجھے خوشی ہے کہ جناب ہوبوہم نے میری پُرزور درخواست کو قابلِ اعتنا سمجھا۔ اور اس ملاقات کے چار ماہ بعد، مذکورہ بالا تقریر میں اقبال اور جرمنی کے تعلقات پر ("نامہ و پیام دل کا" کے عنوان سے) روشنی ڈالی۔ وہ علامہ کے دو خطوط بھی (زیرِ نظر مجموعے کے خطوط نمبر ۲ مورخہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۰۷ء اور نمبر ۵ مورخہ ۲ دسمبر ۱۹۰۷ء) دبستانِ شرقی و افریقائی لندن، (SOAS) کی تقریب میں منظرِ عام پر لائے۔ اور جیسا کہ اُوپر بیان ہوا ہے، انھوں نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ ان خطوط کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔

اب چند باتیں خطوں کے ترجمے کے بارے میں۔ ان ستائیس خطوط میں پہلے سترہ خط جرمن زبان میں ہیں، اور آخری دس انگریزی زبان میں۔ اقبال نے جرمن زبان صرف چار پانچ مہینے میں سیکھی تھی۔ چنانچہ یہ بہت مبتدیانہ تھی، اور انھیں اس کا شدت سے احساس بھی تھا۔ وہ بار بار اپنے خطوں میں لکھتے ہیں (مثلاً دیکھیے خط نمبر ۱۶، ۱۱ مئی ۱۹۱۱ء جس میں وہ لکھتے ہیں کہ "میرے خطوط آپ کو اس خوفناک جرمن زبان کی وجہ سے جو میں لکھتا ہوں، کافی دل لگی کا سامان بہم پہنچاتے ہوں گے")۔ ان خطوط کے متن کی بڑے پیمانے پر لسانی تصحیح و تہذیب میری بیوی نے کی ہے، جو جرمن نژاد ہیں۔ اس کے بعد جرمن زبان میں لکھے گئے تمام خطوں کا انگریزی میں ترجمہ میری بیٹی انجم افروز نے کیا ہے جو مجھ سے زیادہ جرمن زبان پر دسترس رکھتی ہیں۔ آخر میں ان خطوں کو اردو زبان کا جامہ میں نے پہنایا ہے۔ یہاں میں نے اس امر کا لحاظ رکھا ہے کہ اردو ترجمہ سہل ہو، اور تقریباً اسی سطح کا ہو جس پر اقبال نے جرمن میں خطوط لکھے تھے۔ تاہم میں نے بالعموم اُن کی زبان و بیان کی غلطیوں سے درگذر کیا ہے۔ کیونکہ اقبال کی جرمن زبان سے نسبتاً کم واقفیت پر معترض ہونا بالکل نامناسب ہے۔ ہاں میں نے حاشیے میں کہیں کہیں وضاحتی اشارات بھی دے دیے ہیں۔ (۳)

آخر میں، میں جناب امان اللہ ہوبوہم کی دخترِ نیک اختر محترمہ شیریں ہوبوہم کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنھوں نے علامہ کے دستی مسودوں کو بڑی دقتِ نظر کے ساتھ پڑھا، اور اُن کو ٹائپ بھی کیا ہے۔ موصوفہ کو جرمن زبان پر کامل عبور حاصل ہے۔ وہ SOAS سے ایم ایس۔ سی کر چکی ہیں، اور اردو بھی جانتی ہیں۔ یہ ٹائپ شدہ مسودہ جناب ہوبوہم نے مجھے نومبر ۱۹۸۲ء میں عطا کیا تھا۔

میں قارئین اور اقبال کے خطوط کے درمیان مزید حائل نہیں ہونا چاہتا، اور علامہ کے اس شعر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں:

الفاظ کے پیچوں میں اُلجھتے نہیں دانا
غوّاص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے؟

راقم الحروف: سعید اختر درانی

ترجمۂ خطوط

خط نمبر ۱

اقامت خانہ تھرز
۴۱۔ شیلنگ سترا سے میونخ۔ (۴)
۱۹ اکتوبر ۰۷ء
(جرمن سے ترجمہ)

عزیزۂ من فرائیلائین (۵) ویگے ناسٹ

مجھے آپ کا کارڈ مل گیا ہے۔ یہ بات قابلِ افسوس ہے کہ جرمن زبان سے میری محدود واقفیت ہمارے درمیان ایک دیوار کی طرح کھڑی ہے۔

اگر میرے خطوط مختصر ہوں، تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ میرے پاس لکھنے کو کچھ نہیں ہے، بلکہ یہ کہ میرا ذریعۂ اظہار ناقص ہے۔ مزید برآں میں نہیں چاہتا کہ اپنی ٹوٹی پھوٹی جرمن سے آپ کی طبیعت خراب کروں۔ لیکن یہ رکاوٹ آپ کے لیے موجود نہیں، چنانچہ مجھے آپ سے مکمل اظہار کی اُمید ہے۔

میں نے اخبار میں ایک اشتہار دے دیا ہے کہ مجھے ایک اچھی اُستانی کی ضرورت ہے۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ ہائیڈل برگ کے قیام کے دوران میں نے جرمن لکھنے کی مشق نہ کی۔ یہ وہ پہلی تحریر ہے، جو میں اس زبان میں لکھ رہا ہوں۔

خزاں کی دھیمی اور نیم آلود ہوا بڑی خوشگوار ہے۔ موسم بڑا خوبصورت ہے، لیکن افسوس کہ ہر حسین چیز کی طرح یہ بھی بے دوام ہے۔ (۶)
براہ کرم جلد خط لکھیے۔ (۷)

خدا حافظ
آپ کا دوست ایس۔ ایم اقبال

(۲)

اقامت خانہ تھرز (۸)
۴۱- شیلنگ سٹرا سے
میونخ-
۲۳ اکتوبر ۰۷ء (جرمن سے)

عزیزہ من فرائیلائن ویگے ناسٹ

یہ آپ کا بڑا کرم تھا کہ آپ نے (خط) لکھا، لیکن بہت مختصر۔ میں اُس وقت تک آپ کو نہیں لکھوں گا، جب تک آپ مجھے وہ خط نہیں بھیجتیں، جو آپ نے پھاڑ ڈالا ہے۔ یہ بڑی بے رحمی ہے۔ آپ ہائیڈل برگ میں تو ایسی نہیں تھیں۔ شاید ہائیل برون (Heilbronn) کی آب وہوا نے آپ کو بے مہر بنا دیا ہے۔

میں زیادہ لکھنا چاہتا تھا، مگر...وہ خط آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میرا خط پھاڑ ڈالیں۔(۹)

آپ کا بہت مخلص (۱۰)
ایس۔ایم اقبال

نوٹ لفافے پر یہ پتا لکھا ہے:

Frl. Emma Wegenast
Louisen Strasse
Heilbronn

ٹکٹ پر میونخ کی مہر ہے۔

(۳)

اقامت خانہ تھرز
۴۱- شیلنگ سترا سے
میونخ
۲۷ اکتوبر ۰۷ء
(جرمن سے)

عزیزہ من مس (۱۱) ویگے ناسٹ

میں آپ کے خط کے لیے شکر گزار ہوں۔ مجھے میونخ بڑا پسند آیا ہے۔ جناب رائٹر (۱۲) نے یہاں اپنی ایک جاننے والی کو لکھا تھا، اور انھوں نے میرے لیے ایک اُستانی ڈھونڈ لی ہے۔

اگرچہ اس مکان میں جرمن زبان بولنے کا کوئی موقع میسر نہیں آتا، تاہم میں دونوں اُستانیوں کے ساتھ کافی گفتگو کر لیتا ہوں۔ کل ہم لوگ ایک نمائش ہنر (۱۳) دیکھنے کے لیے گئے۔ وہاں اتنی بہت خوبصورت تصویریں ہیں کہ انسان خود کو ایک دنیائے خواب میں محسوس کرتا ہے۔ ہم نے وہاں دو گھنٹے گزارے، اور میری اُستانی، جو آرٹ کی سمجھ رکھتی ہیں، میرے لیے ایسی باتوں کی وضاحت کرتی رہیں، جن سے میں اس سے پہلے بے خبر تھا۔

کل مجھے محترمہ پروفیسر صاحبہ کا خط موصول ہوا، اُنھیں جناب رائنر سے اطلاع ملی تھی کہ میں اس اقامت خانے سے خوش نہیں ہوں۔ میں نے انھیں لکھا ہے کہ جو شخص اقامت خانۂ شیرر (۱۴) میں رہ چکا ہو، اسے اور کوئی اقامت گاہ پسند نہیں آسکتی۔

آج میں باہر نہیں نکل سکتا، موسم خوشگوار نہیں ہے۔ براہ کرم میری بھدی جرمن زبان کا برا مت مانیے، اور نہ اس کا جو میں نے اپنے پہلے میں لکھا تھا۔ امید ہے کہ آپ بالکل بخیریت ہوں گی۔ مجھ میں سوچنے اور صحیح زبان لکھنے کی شکیبائی نہیں ہے۔(۱۵)

آپ کا دوست
ایس۔ایم اقبال

(۴)

لندن
۱۶ نومبر ۱۹۰۷ء
(جرمن سے)

عزیزۂ من، مس ویگے ناسٹ

مجھے آپ کا خط مل گیا ہے۔ لیکن میں ابھی تک جم کر نہیں بیٹھ سکا ہوں۔(۱۶) ٹھہر کر لکھوں گا۔

دلی نیک تمنائیں
اقبال (۱۷)

(۵)

معرفت طامس لگ اینڈسن (۱۸)
لڈگیٹ سرکس
لندن
(جرمن سے)
۲دسمبر ۱۹۰۷ء

عزیزۂ من، فرائیلائین ایما

مجھے آپ کا خط موصول ہو گیا ہے۔ وہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ میں اپنی جرمن زبان بھول گیا ہوں۔ میں بہت مصروف تھا۔ اور زیادہ نہ سیکھ سکا۔(۱۹) آپ انگریزی کیوں نہیں سیکھتیں؟ میرے لیے آپ کو لکھنا اور اپنے دل کی بات کہنا بہت آسان ہو جائے گا۔

میرا خیال تھا کہ میں ہائیل برون Heilbronn کے رستے سفر کرسکوں گا۔(۲۰) لیکن یہ ممکن نہ ہوا۔ میرے لیے یہ قطعی لازم تھا کہ میں پانچ نومبر کو لندن میں ہوں پروفیسر آرنلڈ مصر گئے ہیں، اور میں عربی کا پروفیسر مقرر ہوا ہوں۔ میرے ذمے ہفتے میں دو لکچر ہیں۔

میں زیادہ لکھ یا کہہ نہیں سکتا۔ آپ تصور کر سکتی ہیں کہ میری روح (؟) میں کیا ہے میری بہت بڑی خواہش یہ ہے کہ میں دوبارہ آپ سے بات کر سکوں اور آپ کو دیکھ سکوں ... لیکن میں نہیں جانتا کہ کیا کروں۔ جو شخص آپ سے دوستی کر چکا ہو، اس کے لیے ممکن نہیں کہ آپ کے بغیر وہ جی سکے۔ براہِ کرم میں نے جو لکھا ہے اس کے لیے مجھے معاف فرمائیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ اس قسم کے اظہارِ جذبات کو پسند نہیں کرتیں۔

براہ کرم جلد لکھیے اور سب کچھ۔ یہ اچھا نہیں ہے کہ کسی شخص کا کچھ بگاڑا(۲۱) (؟) جائے جو آپ کا کچھ نہیں بگاڑتا۔(۲۲) (؟)

آپ کا مخلص (۲۳)
ایس۔ایم اقبال

(۶)

معرفت طامس لگ اینڈسن
لڈگیٹ سرکس
لندن ای سی (۲۴)
۲۰جنوری ۱۹۰۸ء

(جرمن سے)

عزیزہ من، مس ویگے ناسٹ

میں آپ کی تصاویر کے لیے ہزار گونہ شکریہ ادا کرتا ہوں، جو آج شام مجھے موصول ہوئیں۔ یہ آپ کی بڑی کرم فرمائی ہے۔ دونوں تصویریں بڑی خوبصورت ہیں، اور وہ ہمیشہ میرے مطالعے کے کمرے میں میری میز پر رہیں گی، لیکن یہ مت باور کیجیے کہ وہ صرف کاغذ ہی پر نقش ہیں۔ بلکہ وہ میرے دل...(۲۵) میں بھی جا پذیر ہیں۔ اور تادوام رہیں گی۔

شاید میرے لیے یہ ممکن نہ ہوگا کہ میں دوبارہ آپ کو دیکھ پاؤں... لیکن میں یہ ضرور تسلیم کرتا ہوں کہ آپ میری زندگی میں ایک حقیقی قوت بن چکی ہیں۔ میں آپ کو کبھی فراموش نہ کروں گا۔ اور ہمیشہ آپ کے لطف و کرم کو یاد رکھوں گا۔

میں اپنی جرمن زبان بالکل بھول چکا ہوں۔ آپ ہی کیوں انگریزی نہیں سیکھ لیتیں؟ یوں ہم ایک دوسرے کی بات بہتر سمجھ سکیں گے۔ براہ کرم جلد خط لکھیے۔ جونہی میری فوٹوگراف بنتی ہے، میں بھی آپ کو اپنی تصویر بھیج دوں گا۔

خدا حافظ میری عزیزہ مس ایما(۲۶)، اور ہمیشہ جانیے۔

آپ کا
ایس۔ایم اقبال

لفافے پر پس تحریر: میں دونوں تصویریں اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔

(۷)

معرفت طامس کک اینڈ سن
لڈگیٹ سرکس
لندن ای۔سی
۲۱ جنوری ۱۹۰۸ء(۲۷)
(جرمن سے)

میری عزیزہ مس ایما،

کیا آپ یہ سمجھتی ہیں کہ میں تغافل شعار ہوں؟ یہ بالکل ناممکن ہے... جب آپ کا پچھلا خط پہنچا تو میں بڑا بیمار تھا، اور اس نے مجھے اور بھی بیمار کر ڈالا۔ کیوں کہ آپ نے لکھا تھا کہ آپ نے

بڑے طوفانوں میں سے گزرنے کے بعد اپنی طمانیتِ قلب(۲۸) دوبارہ حاصل کرلی ہے۔ میں یہ سمجھا کہ آپ میرے ساتھ مزید خط و کتابت نہیں کرنا چاہتیں، اور اس بات سے مجھے بڑا دکھ ہوا۔ اب مجھے پھر آپ کا خط موصول ہوا ہے، اور اس سے مجھے بڑی مسرت ہوئی ہے۔ میں ہمیشہ آپ کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔ اور میرا دل ہمیشہ بڑے خوبصورت خیالوں سے معمور رہتا ہے!

ایک شرارے سے ایک شعلہ اٹھتا ہے۔ اور ایک شعلے سے ایک بڑا الاؤ روشن ہو جاتا ہے! لیکن آپ سرد مہر ہیں، غفلت شعار ہیں۔ آپ جو جی میں آئے کیجیے۔ میں بالکل کچھ نہ کہوں گا، اور ہمیشہ صابر و شاکر رہوں گا۔

شاید جب میں ہندوستان کو روانہ ہوں گا، تو آپ سے ملاقات کرسکوں گا۔ میں اپنی جرمن تمام تر بھول چکا ہوں۔ آپ انگریزی کیوں نہیں سیکھ لیتیں؟

آپ کا
اقبال

(۸)

معرفت طامس لگ اینڈ سن
لڈگیٹ سرکس
لندن ای۔ سی
۲۶ فروری ۱۹۰۸ء
(جرمن سے)

عزیزۂ من مس (۲۹) ویگے ناسٹ

میں ہر چیز کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ مجھے اس قدر مصروفیت رہی کہ میں آپ کو خط نہیں لکھ پایا ہوں۔ آپ ایسی فرشتہ خصلت ہیں کہ میں امید رکھتا ہوں کہ آپ مجھے معاف کر دیں گی۔ آج شام بھی مجھے ایک لیکچر دینا ہے "تصوف" چند روز ہوئے مجھے محترمہ پروفیسر صاحبہ کا خط موصول ہوا۔ ان کا ایک فرانسیسی طالب علم لندن میں تھا، اور ہم دونوں نے مل کر محترمہ پروفیسر صاحبہ کو ایک خط لکھا۔ آپ انگریزی کیوں نہیں سیکھ لیتیں؟ مجھے آپ کے کانوں کو اپنی بھونڈی جرمن سے موردِ توہین بنانے پر شرم آتی ہے ... بہرحال میں اس خط و کتابت کو جرمن زبان کے سبق لینے کا ایک بہانہ سمجھتا ہوں۔ سو آپ مجھے اب تک درس دے رہی ہیں۔

میں جولائی کے اوائل میں ہندوستان لوٹ رہا ہوں۔ اور میری تمنا ہے کہ اپنے سفر سے

پیشتر آپ سے ملنے کا موقع مجھے حاصل ہو سکے گا۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ چند روز کے لیے ہائیڈل برگ آ سکوں۔ لیکن اگر ممکن ہو تو کیا آپ پیرس میں مجھ سے مل سکتی ہیں؟ آپ ہائیڈل برگ کب آئیں گی؟(۳۰) جناب رائنر (Herr Reiner) کہاں ہیں؟ وہ مجھے بالکل خط نہیں لکھتے۔ میں دو مرتبہ انھیں لکھ چکا ہوں۔ شاید وہ بے حد مصروف ہیں۔ آپ تمام دن کیا کرتی ہیں؟ کیا آپ مطالعہ کرتی ہیں، یا سہیلیوں کے ساتھ وقت گزارتی ہیں؟

آپ کی تصویر میری میز پر رکھی ہے، اور ہمیشہ مجھے ان سہانے وقتوں کی یاد دلاتی ہے، جو میں نے آپ کے ساتھ گزارے تھے۔

ایک تسبیحِ خیالاتِ خوش آئند کے ساتھ

آپ کا
ایس۔ ایم اقبال

(۹)

معرفت طامس کک اینڈ کمپنی
لڈگیٹ سرکس
لندن ای۔ سی
۳ جون ۱۹۰۸ء،
(جرمن سے)

عزیزہ من مس ویگے ناسٹ

مجھے آپ کا خط پہنچا، اور میں فوراً جواب لکھ رہا ہوں۔ شاید آپ کو میرا جواب موصول نہیں ہوا ہے۔ آپ کے پوسٹ کارڈ کے لیے بے حد شکریہ...

براہ کرم جلد لکھیے اور مجھے بتائیے کہ آپ کیا کر رہی اور سوچ رہی ہیں؟ آپ میرے خط کا انتظار کیوں کرتی ہیں؟ میں ہر روز آپ سے اطلاع پانے کی آرزو رکھتا ہوں۔ مس فیضی(۳۱) اپنی بہن اور برادرِ نسبتی کے ساتھ یہاں ہیں، جو کہ ایک ہندوستانی نواب(۳۲) ہیں۔ میں چند روز ہوئے ان سے ملنے گیا تھا۔ وہ بخیریت اور بڑی خوش و خرم ہیں۔ شاید وہ جرمنی جائیں گی۔

میں بہت مصروف ہوں۔ جلد انگلستان سے رخصت ہو رہا ہوں آغازِ جولائی میں مجھے معلوم نہیں کہ میرا جرمنی کے رستے سفر کرنا ممکن ہوگا یا نہیں۔ یہ میری بہت بڑی تمنا ہے کہ میں ہندوستان لوٹنے سے پہلے آپ سے ملاقات کر سکوں۔ بے رحم نہ بنیے۔ پلیز(۳۳) جلد خط لکھیے اور

تمام احوال بتایئے۔ میرا جسم یہاں ہے، میرے خیال جرمنی میں ہیں۔ آج کل بہار کا موسم ہے سورج مسکرا رہا ہے۔ لیکن میرا دل غمگین ہے۔ مجھے کچھ سطریں (۳۴) لکھیے۔ اور آپ کا خط میری بہار ہوگا۔ میرے دل غمگیں میں آپ کے لیے بڑی خوبصورت سوچیں ہیں، اور یہ خاموشی سے ایک کے بعد ایک آپ کی طرف روانہ ہوتی ہیں۔ یہ ہیں آپ کے لیے میری تمنائیں۔

آپ کا
اقبال

(۱۰)

معرفت طامس لگ اینڈسن
لڈگیٹ سرکس
لندن ای۔سی
۱۰ جون ۱۹۰۸ء
(جرمن سے)

عزیزہ من مس ویگے ناسٹ

میں آپ کو پہلے لکھ چکا ہوں، اور آپ کے خط کا منتظر ہوں۔ مع ہذا میں اپنی ایک تصویر ملفوف کر رہا ہوں۔ شاید میں ایک اور تصویر آپ کو بھیجوں گا۔

آپ کا
ایس۔ایم اقبال

بس تحریر۔ میں ۲ جولائی کو (۳۵) ہندوستان روانہ ہو رہا ہوں۔ اور وہاں سے خط لکھوں گا۔

(۱۱)

۴۹۔ایلشم روڈ
کینسنگٹن غرب
لندن (۳۶)
۲۷ جون ۱۹۰۸ء
(جرمن سے)

عزیزہ من مس ایما،

میں نے اپنی سی پوری کوشش کی ہے۔ کہ جرمنی کے رستے سفر کر سکوں، لیکن یہ ممکن نہیں ہے۔ میں تین جولائی کو انگلستان سے روانہ ہوں گا۔ اور چند روز پیرس میں رکوں گا، جہاں مجھے کچھ کام ہے۔

براہ کرم فوراً لکھیے میں ہندوستان روانہ ہونے سے پہلے آپ کا خط پانے کا متمنی ہوں۔ میں اگلے سال یورپ واپس آنے اور آپ سے ملنے کی امید رکھتا ہوں۔(۳۷) مت بھولیے گا کہ اگرچہ کئی ملک اور سمندر ہمیں ایک دوسرے سے جدا کریں گے پھر بھی ہمارے درمیان ایک غیر مرئی رشتہ قائم رہے گا۔ میرے خیالات ایک مقناطیسی قوت کے ساتھ آپ کی طرف دوڑیں گے، اور اس بندھن کو مضبوط بنائیں گے۔ ہمیشہ مجھے لکھتی رہیے گا، اور یاد رکھیے گا کہ آپ کا ایک سچا دوست ہے، اگرچہ وہ فاصلۂ دراز پر ہے۔ جب دل ایک دوسرے کے قریب ہوں، تو فاصلہ کچھ معنی نہیں رکھتا۔

براہ کرم فی الفور لکھیے۔

آپ کا

ایس۔ ایم۔ اقبال

پس تحریر مجھے جناب خنفر(۳۸) کی بیماری کا سن کر بڑا افسوس ہوا ہے۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ صحت کا خیال رکھیں۔

(۱۲)

سیالکوٹ شہر(۳)

ہندوستان

۳ ستمبر ۱۹۰۸ء

(جرمن سے)

عزیزَمن مس ویگے ناسٹ

میں یہاں پہنچ گیا ہوں۔ یہ بہت ہی افسوس کی بات ہے کہ میں انگلستان سے رخصت ہونے سے پہلے آپ سے مل نہ سکا۔ براہ کرم جلد لکھیے کہ آپ ان دنوں کیا کر رہی ہیں۔ میں نے اپنے پیشے کا آغاز لاہور میں کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ ایک وکیل کے لیے اچھی جگہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ ہائیڈل برگ میں ہوں گی۔ براہ کرم جناب اور محترمہ پروفیسر صاحبان کو میرا سلام دیجیے گا۔

اور جب آپ لوگ ایک ساتھ ہوں، تو مجھے یاد کیجیے گا۔

یہاں بڑی بارش ہوئی ہے۔(۴۰) ہر طرف پانی ہی پانی ہے، اور مزید کی توقع ہے۔

میں اپنی ساری جرمن زبان بھول گیا ہوں، لیکن مجھے صرف ایک لفظ یاد ہے... ایما۔

آپ کا

ایس۔ ایم۔ اقبال

(۱۳)

لاہور (۴۱)

ہندوستان

۱۱ جنوری ۱۹۰۹ء

(جرمن سے)

عزیزہ من مس ایما،

آپ کے پُر تلطف خط کے لیے بے حد شکریہ۔ یہ آپ کا بڑا کرم ہے کہ آپ نے مجھے لکھا، اور مجھے یاد رکھا، جب کہ میں جرمنی سے اس قدر دور ہوں۔ مجھے ہائیڈل برگ سے آپ کا کوئی خط موصوم نہیں ہوا۔ شاید آپ کا خط گم ہو گیا ہے۔ اور مجھے یہ جان کر بڑا افسوس ہوا ہے کہ میرا خط (بھی) راستے میں گم ہو گیا ہے۔

جب ہندوستان پہنچا، تو میرے ہم وطنوں نے مجھے بہت بڑا اعزاز بخشا۔ میرے لیے اسے لفظوں میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ ملک کے ہر گوشے سے مجھے چالیس کے قریب نظمیں بھیجی گئیں، دوستوں اور دوسرے لوگوں کی طرف سے خوش آمدید کے طور سے جب میں لاہور پہنچا تو لوگوں نے مجھے سونے کا ہار دیا۔ جو میرے سر پر پہنایا گیا۔ بمبئی سے لے کر لاہور اور سیالکوٹ تک ہر اسٹیشن پر ہزارہا لوگ جمع تھے۔ جہاں میں نے دیکھا کہ بہت سے لڑکے اور بڑے (۴۲) رستے کے اسٹیشنوں پر (۴۳) میری نظمیں گا رہے تھے۔

مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ جب میں گھر پہنچا تو میرے والدین بالکل باصحت تھے۔ میری بہنیں اور والدہ بڑی مسرور ہیں کہ اب میں ان کے پاس ہوں۔

میں اب لاہور میں ہوں اور یہاں ایڈوکیٹ کے طور سے کام کر رہا ہوں۔ یہ میرے لیے ممکن نہیں کہ میں کبھی آپ کے خوبصورت وطن کو بھول سکوں، جہاں میں نے بہت کچھ سیکھا۔ اور... براہ کرم ہمیشہ مجھے لکھتی رہیے گا۔ شاید ہم دوبارہ جرمنی یا ہندوستان میں ایک دوسرے سے مل

سکیں۔ کچھ عرصے بعد جب میرے پاس کچھ پیسے جمع ہو جائیں گے تو میں یورپ میں اپنا گھر بناؤں گا۔ یہ میرا تصور ہے(۴۴) اور میری تمنا ہے کہ یہ سب پورا ہوگا۔(۴۵)

جناب خاوَبال(۴۶) کے انتقال کی خبر سن کر بڑا افسوس ہوا۔ شاید آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے ان کی صحت کے بارے میں ان سے کئی بار تذکرہ کیا تھا۔

براہ کرم اپنے اس دوست کو مت بھولیے جو آپ کو ہمیشہ اپنے دل میں رکھتا ہے۔(۴۷) اور جو آپ کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ ہائیڈل برگ میں میرا قیام مجھے ایک خوبصورت خواب سا لگتا ہے، اور میں اس خواب کو دہرانا چاہتا ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے؟ آپ خوب (بہتر؟) جانتی ہیں۔

دلی نیک خواہشات کے ساتھ

آپ کا

ایس۔ ایم۔ اقبال

بار۔ ایٹ لاء

لاہور

ہندوستان

(۱۴)

جرمنی بالائے کل(۴۸)

لاہور

(ہندوستان)

۲۰ جولائی ۱۹۰۹ء

(جرمن سے)

عزیزہ من فرائیلائین ایما(۴۹)

یہ آپ کی بڑی نوازش ہے کہ آپ نے مجھے لکھا ہے۔ مجھے آپ کا خط پا کر (ہمیشہ) بہت ہی مسرت ہوتی ہے اور میں بے تابی سے اُس وقت کا منتظر ہوں، جب میں دوبارہ آپ کے وطن میں آپ سے مل سکوں گا۔ براہ کرم مجھے ہمیشہ ہمیشہ لکھتی رہیے۔ مجھے جرمنی بہت پسند ہے۔ اس نے میرے آدرشوں(۵۰) پر بہت اثر کیا ہے اور میں جرمنی میں اپنا قیام کبھی فراموش نہ کروں گا۔ میں یہاں بالکل اکیلا رہتا ہوں، اور خود کو بڑا غمگین پاتا ہوں۔ ہماری تقدیر ہمارے اپنے ہاتھوں میں نہیں ہے۔ ایک ایسی عظیم قوت ہے جو ہماری زندگیوں کو منظم کرتی ہے۔ محترمہ پروفیسر

صاحبہ، جناب پروفیسر صاحب، اور تمام خواتین و حضرات کو میں ہمیشہ اپنے دل میں رکھتا ہوں۔
آہ! وہ دن جب میں جرمنی میں تھا!

مس فیضی بمبئی میں ہیں۔ ان کی والدہ انتقال کر گئی ہیں اور وہ بہت غمزدہ ہیں۔ اب وہ کچھ بہتر ہیں۔ بعض اوقات میں خود کو بالکل تنہا محسوس کرتا ہوں اور میرے دل میں یورپ، اور بالخصوص جرمنی کو دوبارہ دیکھنے کی بڑی آرزو پیدا ہوجاتی ہے۔ براہ کرم مجھے اپنے دل اور اپنی یادوں میں ایک چھوٹی سی جگہ دیجیے گا۔

آپ کا دوست
ایس۔ ایم۔ اقبال
بار۔ ایٹ۔ لاء

(۱۵)

لاہور
ہندوستان
۲۲ ستمبر ۱۹۱۰ء
(جرمن سے)

عزیزہ من مس ویگے ناسٹ

مجھے آپ کا نوازش نامہ موصول ہوگیا ہے، جس کے لیے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔
آج ڈاک کا دن ہے۔ (۵۱) لیکن بد قسمتی سے میں بہت مصروف ہوں۔
اگلے ہفتے میں آپ کو ایک طویل (تر) خط لکھوں گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ممکن ہوگا۔
یہ پوستین ایک تبتی بھیڑ کی ہے۔ (۵۲) یہ دراصل ایک اوور کوٹ کے کالر اور بازوؤں کے لیے ہے۔

دلی نیک تمناؤں کے ساتھ
محمد اقبال
بار ایٹ لاء
لاہور (ہندوستان)

(۱۶)

لاہور
ہندوستان
۱۱ مئی ۱۹۱۱ء
(جرمن سے)

عزیزۂ من فرائیلائین (۵۳) ویگے ناسٹ

آپ کا خوب صورت پوسٹ کارڈ مجھے مل گیا ہے اور اس کے لیے میں آپ کو اپنے دلی تشکرات بھیجتا ہوں۔ میری بڑی تمنا ہے کہ جرمنی کا دوبارہ سفر کروں تاکہ آپ سے مل سکوں۔ اور (= مگر) میں نہیں جانتا کہ یہ کس دن ممکن ہوسکے گا۔ لیکن میرے خطوط آپ کو اُس "ظالم" (۵۴) جرمن زبان کی وجہ سے، جو میں لکھتا ہوں، کافی دل لگی کا سامان بہم پہنچاتے ہوں گے۔

وہ خوب صورت ٹائیاں (۵۵) مجھے مل گئی تھیں۔ اور میں بے حد شرمندہ ہوں کہ میں اس قدر مصروف تھا کہ آپ کو لکھ نہ سکا، اور اپنا شکریہ نہ بھیج سکا۔

جب آدمی کوئی زبان نہیں لکھ سکتا، تو اس کا قلم (۵۶) بہت دل شکستہ (۵۴) ہوتا ہے۔ اور ایسے انسان کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ اپنے شکریے کا پورا اظہار کرسکے۔ میرے پاس بالکل وقت نہیں ہے کہ اپنی جرمن صحیح کرسکوں۔ براہ کرم میری غلطیوں کو معاف فرمائیے، لیکن مہربانی کرکے ایک طویل خط لکھیے۔ مجھے امید ہے کہ محترمہ پروفیسر صاحبہ بخیریت ہوں گی۔

آپ کا دوست
محمد اقبال

(۱۷)

(جرمن سے)

آپ کے خط کے لیے بہت شکریہ۔ براہ کرم مجھے لکھیے کہ آپ کیسی ہیں؟ ان دنوں لاہور میں بے حد گرمی ہے۔ ہم ایک دوزخ میں رہ رہے ہیں۔ میں جرمنی کو کبھی نہ بھول سکوں گا۔

اقبال
چہارم جولائی ۱۹۱۲ء

محترمہ پروفیسر صاحبہ کا کیا ہے؟ میرے خیال میں گھر بھرا ہوا ہوگا۔ (۵۸) یہ دلی کی جامع مسجد ہے۔ (۵۹)

(۱۸)

لاہور
ہندوستان
۳۰ جولائی ۱۳ء
(انگریزی سے ترجمہ (۶۰)

ڈیر مس (۶۱) ویگے ناسٹ

مجھے آپ کے والد صاحب کی وفات کی خبر سن کر بے انتہا صدمہ ہوا ہے۔ اور اگرچہ میرا خط اس افسوس ناک سانحے کے بہت دنوں بعد آپ تک پہنچے گا، تاہم اس اندوہناک نقصان میں آپ کے ساتھ مجھے جو ہمدردی ہے، اس کی شدت کو نہ وقت کم کرسکتا ہے، نہ فاصلہ۔ اس خبر سے مجھے حقیقتاً بے حد دکھ ہوا ہے، اور میں خدائے تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس بزرگ اور قابلِ احترام ہستی پر اپنے انعام و اکرام کی بارش کرے۔ اناللہ وانالیہ راجعون (۶۲)۔ یہ وہ آیت مقدسہ ہے، جو ہم کسی کی وفات کی خبر سن کر پڑھتے ہیں۔ اور آپ کا غم اندوز خط پڑھ کر میں نے یہ آیت بار بار دہرائی۔ ایسے سانحات ہر شخص کی زندگی میں ضرور رونما پذیر ہوتے ہیں۔ اور یہ لازم ہے کہ ہم اپنے مصائب کا مقابلہ اُسی پامردی سے کریں، جیسا کہ اُن لوگوں نے کیا جن کی زندگیاں ہمارے لیے شمعِ ہدایت ہیں۔

آپ کو یاد ہوگا کہ گوئٹے نے اپنے لمحۂ موت میں کیا کہا تھا: "مزید روشنی"۔ موت مزید روشنی کی طرف ایک نئی راہ وا کرتی ہے اور ہمیں اُن مقامات تک لے جاتی ہے، جہاں ہم ابدی حسن و صداقت کے روبرو کھڑے ہوجاتے ہیں۔ مجھے وہ وقت بخوبی یاد ہے، جب میں نے گوئٹے کی شاعری آپ کے ساتھ پڑھی۔ اور مجھے اُمید ہے کہ آپ کو بھی وہ ایامِ خوش یاد ہوں گے، جب ہم روحانی طور سے ایک دوسرے کے قریب تھے۔ اور میں محسوس کرتا ہوں کہ ہم اب بھی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ یہاں تک کہ میں روحانی لحاظ سے آپ کا شریک غم ہوں۔

جب آپ کا خط لکھنے کو جی چاہے، تو براہِ کرم مجھے ضرور لکھیے۔ کاش کہ میں جرمنی میں ہوتا، تاکہ اپنی ہمدردی میں ذاتی طور سے آپ تک پہنچا سکتا۔

فی امان اللہ (۶۳)
ہمیشہ آپ کا (۶۴)
محمد اقبال ایڈووکیٹ
لاہور

(۱۹)

لاہور
۷ جنوری ۱۹۱۴ء
(انگریزی سے)

عزیزہ من فرائیلائین (۶۵) ویگے ناسٹ

کچھ عرصہ ہوا مجھے آپ کا خط ملا تھا۔ جسے پا کر مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی۔ بد قسمتی سے علالت کی وجہ سے میں اس سے پہلے، اس کے جواب سے عہدہ برآ نہیں ہوسکا۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ میں آپ کو آپ کی خوب صورت جرمن زبان میں نہیں لکھ سکتا ہوں، جو مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میں اب بالکل بھول چکا ہوں۔ سوائے اس کے کہ میں اپنے جرمن احباب کے خطوط پڑھ اور سمجھ سکتا ہوں۔ اگلے روز میں ہائنے (۶۶) کا مطالعہ کر رہا تھا اور مجھے وہ پُر مسرت دن یاد آگئے جب ہائیڈل برگ میں محترمہ پروفیسر صاحبہ کے یہاں ہم دونو اُس کو ایک ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ وہ کیا اچھی بزرگ خاتون (۶۷) تھیں! اُمید ہے کہ وہ بخیریت ہوں گی۔ اگر آپ کی اُن سے کہیں ملاقات ہو تو میرا سلام انھیں دیجیے گا۔

مجھے یہ جاننے کا بڑا اچنبھا ہے کہ آپ ان دنوں کیا کر رہی ہیں۔ اور آپ کے کیا ارادے ہیں (اگر ہیں تو) ہوسکتا ہے کہ میں اگلے سال یورپ آؤں۔ لیکن اس کا کچھ ٹھیک (پتہ) نہیں ہے۔ یہ سب حالات پر منحصر ہے۔(۶۸) اگر میں واقعی یورپ آیا، تو یقیناً اُس دیار قدیم جرمنی کا بھی پھر سفر کروں گا، اور آپ سے دوبارہ ہائیڈل برگ یا ہائل برون (Heilbronn) میں ملاقات کو آؤں گا، جہاں سے ہم دونوں ایک ساتھ اُس عظیم فن کار (۶۹) گوئٹے کے مزارِ مقدس کی زیارت کو جائیں گے۔

اگرچہ مجھے آپ کے بھائی اور بہنوں کے ساتھ ملاقات کا کبھی شرف حاصل نہ ہوا تھا، پھر بھی بالضرور میرا سلام ان کو دیجیے گا۔

آپ کا مخلص
محمد اقبال

(۲۰)

لاہور
(ہندوستان)
۱۰ اکتوبر ۱۹۱۹ء
(انگریزی سے)

عزیزہ من فرائیلائین ویگے ناسٹ

آخرکار وہ ہولناک جنگ اب ختم ہو گئی ہے۔(۷۰) اور چار سال کی طویل خاموشی کے بعد مجھے دوبارہ آپ کو خط لکھنے کا موقع حاصل ہوا ہے۔ آپ کا ملک ایک عظیم آزمائش میں سے گزرا ہے۔ اور میں اُمید کرتا ہوں کہ جلد ہی وہ اپنے اُن نقصانات کو پورا کر سکے گا، جو اس جنگ سے اُسے پہنچے ہیں۔ اس تمام عرصے میں میں آپ کی اور آپ کے عزیزوں، اور بالخصوص آپ کے بھائیوں(۷۱) کی سلامتی کے متعلق بہت تشویش مند رہا ہوں۔ براہ کرم جلد ازجلد مجھے اپنے اور اپنے بھائیوں کے حالات کے بارے میں تفصیل سے لکھیے۔ جرمن قوم کو واقعی بہت بڑی قربانیاں دینی پڑی ہیں۔

میں یہ خط انگریزی میں لکھنے کے لیے بڑا معذرت خواہ ہوں، لیکن میں اس بات کو ترجیح دیتا ہوں کہ آپ کو اس خط کا ترجمہ کروانے کی زحمت اُٹھانی پڑے، بہ نسبت اس کے کہ میں اپنی غلط سلط اور بھونڈی جرمن سے آپ کے کان دکھاؤں۔

براہ کرم ہائیڈل برگ والی محترمہ پروفیسر صاحبہ کے بارے میں بھی اطلاع دیجیے۔ کیا آپ کو جناب رائنر (Herr Reiner) صاحب کی طرف سے بھی کوئی خبر وغیرہ ملتی رہی ہے؟ وہ کہاں ہیں، اور کیا کر رہے ہیں؟

آپ کا مخلص
محمد اقبال
بیرسٹر ایٹ لاء
لاہور

(۲۱)

۱۱۳-اے، سینٹ جیمز کورٹ
بکنگھم گیٹ
ایس ڈبلیو(۷۲)
۱۵ اکتوبر ۱۹۳۱ء (۷۳)
(انگریزی سے)

عزیزہ من فرائیلائین ویگے ناسٹ

یہ جناب مٹسروتھ (Herr Metzroth) (۷۴) کی بڑی کرم فرمائی تھی کہ انھوں نے مجھے آپ کا حالیہ پتا بہم پہنچایا، جو مجھے آج صحیح موصول ہوا۔ اور یوں میں آپ کو موجودہ خط لکھنے کے

قابل ہوا ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ خط آپ کو اُن پُرمسرت دنوں کی یاد دلائے گا، جو ہم نے ہائیڈل برگ اسکول یعنی "شیر رمنزل" (Pension Scherer) میں ایک ساتھ بسر کیے تھے۔

براہ کرم مجھے خط لکھیے، اور ان سارے برسوں کے دوران اپنی مصروفیات اور حالات سے مطلع کیجیے۔ مجھے آپ کا جواب پا کر بہت مسرت ہو گی۔ فی الحال ہیں، (۷۵) کافی عرصہ لندن میں رکنا پڑے گا۔ اور جب لندن کی گول میز کانفرنس ختم ہو جائے گی، تو اس کے بعد میرا ارادہ برلن کے رستے روم جانے کا ہے، جہاں مجھے کچھ روز ٹھہرنے اور پرانے چند دوستوں سے ملاقات کرنے کا موقع ملے گا۔ اتنے سالہا سال کے بعد آپ سے مل کر مجھے بے اندازہ خوشی ہو گی۔ مجھے اطلاع دیجیے کہ کیا ابھی کچھ عرصہ آپ ہائیڈل برگ ہی میں قیام رکھیں گی؟

آپ کے خط کا منتظر
محمد اقبال

(۲۲)

۱۱۳۔ اے، سینٹ جیمز کورٹ (۷۶)
بکنگھم گیٹ، ایس ڈبلیو ۱
۲۰ اکتوبر ۱۹۳۱ء
(انگریزی)

عزیزہ من فرائیلائین ویگے ناسٹ

یہ آپ کا غایت درجہ تلطف تھا کہ آپ نے مجھے خط لکھا۔ مجھے آپ کا خط آج صبح سویرے اُس وقت ملا جب میں ابھی بستر ہی میں تھا۔ میں نے اسے ایک سے زیادہ مرتبہ پڑھا۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ میں اسے پا کر بہت خوش ہوا تھا اور کچھ اس لیے کہ میں اسے پوری طرح سمجھ سکوں۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ باوجود اُن تمام آلام و مصائب کے جن سے آپ کو دوچار ہونا پڑا ہے، آپ زندگی سے خندہ پیشانی کے ساتھ عہدہ برآ ہو رہی ہیں۔ میں ہائیڈل برگ کے وہ ایام کبھی فراموش نہ کر سکوں گا، جب آپ نے مجھے گوئٹے کا "فاؤسٹ" پڑھایا، اور دیگر کئی طرح سے میری مدد کی تھی۔ وہ کیا ہی بہجت افزا دن تھے! مجھے آپ کے خط سے معلوم ہوا ہے کہ آپ اپنے وقت پر مختار نہیں ہیں۔ چنانچہ میں اپنی سی پوری کوشش کروں گا کہ میں ہائیڈل برگ آؤں اور آپ سے اُسی پرانے مقام پر ملاقات کروں۔ مجھے اب تک دریائے نیکر یاد ہے، جس کے کنارے پر ہم دونوں ایک ساتھ گھوما کرتے تھے۔ لیکن فی الحال کوئی بات پختہ نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ جلد ہی میں آپ کو اطلاع دے سکوں گا کہ آیا میں روم جاتے ہوئے رستے میں جرمنی سے گزر سکتا ہوں یا نہیں۔ مجھے

روم سے ایک دعوت موصول ہوئی ہے اور میں بالآخر ہندوستان کی واپسی سے پہلے وہاں جانا چاہتا ہوں۔

مجھے یہ کہنے کی بالکل ضرورت نہیں کہ میری یہ بڑی ہی آرزو ہے کہ میں پھر آپ سے ملوں اور اُن پُرمسرت دنوں کی یادیں تازہ کروں جو افسوس کہ اب ہمیشہ کے لیے گزر چکے ہیں۔

دریں اثنا، مجھے تاکید سے خط لکھیے گا۔

آپ کا مخلص
محمد اقبال

پس تحریر: اب میں پروفیسر نہیں ہوں۔

(۲۳)

۱۱۳-اے، سینٹ جیمز کورٹ
بکنگھم گیٹ
این ڈبلیو (کذا) (۷۷)
۱۹ نومبر ۱۹۳۱ء
(انگریزی سے)

مائی ڈیئر مس ویگے ناسٹ

یہ آپ کی بڑی کرم فرمائی تھی کہ آپ نے خط لکھا، اور میں آپ سے ہائیڈل برگ میں ملنے کے لیے منتظر تھا، لیکن مجھے بڑے افسوس کے ساتھ آپ کو اطلاع دینی پڑتی ہے کہ میرے پروگرام میں بعض ایسے ضروری تغیرات یکایک نمودار ہوگئے ہیں کہ جن کے پیشِ نظر اب میرے لیے جرمنی کے رستے سفر کرنا ممکن نہیں رہا۔(۷۸) میں سیدھا روم جارہا ہوں۔ جہاں جناب مارکونی(۷۹) نے مجھے مدعو کیا ہے۔ اور وہاں سے میں ۷ دسمبر کو منعقد ہونے والی مؤتمر عالم اسلامی میں شرکت کرنے کے لیے یروشلم روانہ ہورہا ہوں۔(۸۰) اس امر سے مجھے بےاندازہ خوشی ہوتی کہ میں زندگی میں ایک مرتبہ پھر آپ سے مل سکتا اور پرانی صحبتوں کو پھر زندہ کرسکتا۔ لیکن یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ یہ بات ناممکن ہوگئی ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ میں شاید اگلے سال پھر یورپ آؤں۔ اگر ایسا ہوا تو میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ سے ملنے کے لیے ہائیڈل برگ آنے کی پوری کوشش کروں گا۔ براہِ کرم میرا صمیم قلب سے بھیجا ہوا سلام قبول کیجیے، اور یہ اپنی اُن سہیلیوں کو بھی پہنچائیے جن سے آپ نے ہائیڈل برگ میں میرا تعارف کرایا تھا۔ گاہے بگاہے تاکید سے مجھے میرے لاہور ہندوستان کے پتے پر خط لکھا کیجیے۔ جیسا کہ فارسی کی ایک ضرب المثل ہے۔ "خط

نصف ملاقات ہے"۔

اُمید ہے کہ آپ ہر طرح سے بخیریت ہیں۔

آپ کا مخلص
محمد اقبال

(۲۴)

ڈاکٹر سر محمد اقبال بیرسٹر ایٹ لاء (۸۱)
لاہور (۸۲)
۱۷ جنوری ۱۹۳۲ء
(انگریزی سے)

عزیزہ من فرائیلائین ویگے ناسٹ

مجھے آپ کا خط کل موصول ہوا، اور میں نے اس کے مندرجات بڑی مسرت کے ساتھ پڑھے۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں جرمنی نہ آسکا اور اُن سہانے دنوں کی یادیں تازہ نہ کرسکا، جو میں نے آپ کی اور کچھ دیگر احباب کی معیت میں ہائیڈل برگ میں بسر کیے تھے۔ میرے یہ کہنے کی شاید ضرورت نہیں ہے کہ ان تمام برسوں میں مَیں نے آپ کو کبھی فراموش نہیں کیا، اور میرے دل میں ہمیشہ یہ تمنا زندہ رہی ہے کہ میں دوبارہ آپ سے ملوں گا، لیکن بخت تیرہ کو جو منظور ہوا: اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ اُن دنوں کی یاد، جب ہم گوئٹے کا "فاؤسٹ" ایک ساتھ پڑھا کرتے تھے، ہمیشہ ایک غم انگیز مسرت (۸۳) کے ساتھ میرے دل میں آتی رہتی ہے۔ آپ چاہتی ہیں کہ میں آپ کو بتاؤں کہ ان تمام سالہا سال کے دوران مَیں کیا کرتا اور سوچتا رہا ہوں، تو سُنیے: میں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ اور وہ تمام چیزیں جو میں نے بطور شاعری اور فلسفے کے لکھی ہیں، وہ میں نے شائع کردی ہیں۔ تاہم، میرے ذہن نے ہمیشہ ایک کمی سی محسوس کی ہے، اور خود کو اپنے ان ہندی گردونواح میں تنہا سا پایا ہے۔ جوں جوں میری عمر بڑھ رہی ہے، اس تنہائی کا احساس بھی فزوں تر ہوا جاتا ہے۔ لیکن سوائے تسلیم ورضا کے ہمارے لیے اور کوئی چارہ کار نہیں اور میں نے بھی پوری تسکینِ دل کے ساتھ اپنی قسمت کو قبول کرلیا ہے۔

یہ بات باعثِ تاسُف ہے کہ مَیں جرمن زبان کے ساتھ اپنا رابطہ قائم نہیں رکھ سکا ہوں۔ لیکن میں ہمیشہ آپ کے خطوط کو جرمن لغت کی مدد سے پڑھنے اور سمجھنے کے قابل ہوجاتا ہوں، بجائے اس کے کہ کسی اور سے ان کا ترجمہ کرواؤں۔ اپنے خطوط کسی اور کو دکھانا اچھا نہیں ہوتا۔ آپ کا خط ختم کرنے میں خواہ تین دن لگیں، پھر بھی مَیں اپنے طور پر انھیں ایک لغت کی مدد سے

سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ کسی اور کو دکھاؤں۔ اور میں نے ہمیشہ یہی پیرایۂ عمل اختیار کیا ہے۔

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ آپ اپنی بہن کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں نے ایک مرتبہ اُن کی تصویر دیکھی تھی، جو آپ نے مجھے دکھائی تھی۔ براہ کرم انھیں اور اپنے اُن دوسرے دوستوں کو میرا سلام دیجیے، جن سے میں ضرور جرمنی میں ملا ہوں گا۔ مجھے اُمید ہے کہ میں دوبارہ یورپ آؤں گا، اور اگر میں آیا تو میں بالالتزام آپ سے اور آپ کی ہمشیرہ سے ہائیڈل برگ ملنے آؤں گا۔

جرمنی میرے لیے ایک طرح سے دوسرا روحانی وطن تھا۔ میں نے اُس ملک میں بہت کچھ سیکھا اور بہت کچھ سوچا تھا۔ گوئٹے کے وطن نے میری روح کے اندر ایک دائمی گھر حاصل کر لیا ہے۔

اُمید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گی۔

آپ کا مخلص
محمد اقبال

(۲۵)

۱۲ دسمبر ۱۹۳۲ء
کوئین ایز مینشنز (۸۴)
لندن، ایس ڈبلیو ۱
(انگریزی سے)

عزیزۂ من فرائیلائین ویگے ناسٹ

میں ایک مختصر عرصے کے لیے دوبارہ انگلستان میں ہوں (۸۵) اور یہ خط یہ دریافت کرنے کے لیے لکھ رہا ہوں کہ کیا آپ تاحال ہائیڈل برگ شٹاؤبن سٹراسے نمبر ۱۴، (۸۶) ہی میں مقیم ہیں؟ اُمید ہے آپ ہر طرح سے بخیریت ہوں گی۔ ازراہِ کرم جلدی خط کا جواب دیجیے گا۔

آپ کا مخلص
محمد اقبال

(۲۶)

۲۹ دسمبر ۱۹۳۲ء
کوئین ایز مینشنز
سینٹ جیمز زپارک
لندن ایس ڈبلیوا
(انگریزی سے)

عزیزہ من فرائیلائین ویگے ناسٹ

آپ کے خط کے لیے شکریہ۔ میں لندن سے ۳۰ دسمبر کو روانہ ہوں گا۔ میرے موجودہ پروگرام کے مطابق میں ہائیڈل برگ ۱۸ جنوری ۱۹۳۲ء کو رات کے دس بج کر تئیس منٹ پر (۲۳-۱۰ شب) پہنچوں گا، اور بائر شر ہوف (۸۷) ہوٹل میں ٹھہروں گا۔

ہائیڈل برگ میں میرے قیام کا واحد مقصد آپ سے اتنے سال گزرنے کے بعد دوبارہ ملنا ہے۔

میں آپ سے ملاقات کا بڑے اشتیاق کے ساتھ منتظر ہوں۔(۸۸)

آپ کا مخلص
محمد اقبال

(۲۷)

میڈرڈ
۲۱ جنوری ۱۹۳۳ء
(انگریزی سے)

عزیزہ من فرائیلائین ویگے ناسٹ

میں جنوبی ہسپانیہ کے دورے کے بعد آج میڈرڈ واپس پہنچا ہوں۔ افسوس کہ میرے لیے اس مرتبہ ہائیڈل برگ آنا ناممکن ہوگا۔ مجھے وہ سارے ٹکٹ منسوخ کرنے پڑے جو میں نے لندن میں خریدے تھے۔ کیونکہ میرے لیے لازمی ہے کہ میں وینس سے دس فروری ۱۹۳۳ء کو روانہ ہونے والا جہاز کونٹے وردی (۸۹) پکڑوں۔ ہوسکتا ہے کہ میں اپریل میں پھر انگلستان آؤں۔

آپ کا
محمد اقبال (۹۰)

حرف آخر

گول میز کانفرنس کے خاتمے کے بعد علامہ اقبال دسمبر کے آخر میں ٹرین کے ذریعے لندن سے پیرس گئے، جہاں وہ برگساں سے ملے۔ اس کے بعد وہ سیدھے میڈرڈ چلے گئے۔ اور وہ نہ جانے ہائیڈل برگ کے راستے کیوں نہ گئے۔ جو پیرس سے اتنا دور نہ تھا۔ شاید کانفرنس کے کچھ اور مندوبین اُن کے ساتھ ہوں (۹۱) جن کے ساتھ انھیں اپنا پروگرام منطبق کرنا پڑا۔ میڈرڈ کے بعد، بقول ڈاکٹر عبدالسلام خورشید (سرگذشت اقبال، ص۴۱۹- ۴۲۳) علامہ اقبال روم بھی گئے جہاں وہ مسولینی سے ملے۔ لیکن خورشید صاحب کو مغالطہ ہوا ہے چونکہ علامہ ۲۷ نومبر ۱۹۳۱ء کو یعنی دوسری گول میز کانفرنس کے خاتمے کے بعد) مسولینی سے مل چکے تھے دیکھیے: "سفرنامۂ اقبال" (از محمد حمزہ فاروقی- ص۱۲۱- ۱۲۶)- بہر حال علامہ اقبال وینس سے دس فروری ۱۹۳۳ء کو جہاز سے روانہ ہو کر ۲۲ فروری کے روز بمبئی، اور پھر ۲۵ فروری ۱۹۳۳ء کو لاہور پہنچ گئے۔ اس کے بعد وہ اپریل میں دوبارہ لندن نہ گئے (جہاں شاید گول میز کانفرنس کی کچھ اور کارروائیاں ہو رہی تھیں) اور نہ لوتھیئن کی طرف سے آکسفورڈ یونی ورسٹی میں Rhodes Lectures دینے کی دعوت ملی تھی- ۱۹۳۵ء میں ان لیکچروں کا انعقاد بھی طے پا گیا تھا، لیکن علامہ اقبال اپنی طویل بیماری کی وجہ سے انگلستان نہ جا سکے، اور یہ لیکچر منسوخ کرنے پڑے۔ اس طرح علامہ کو باوجود اپنی تمام تر خواہش کے، زندگی بھر دوبارہ جرمنی جانے اور مس ویگے ناسٹ سے ملنے کا موقع نہ مل سکا۔

(سعید اختر درّانی)

حواشی

(۱) یہ مضمون زیر نظر کتاب میں بھی شامل ہے۔ دیکھیے ص۸۵- ۱۰۲۔

(۲) لیکن دیکھیے میرا نوٹ، ص ۹۴، اور دیباچہ کتاب (درانی ۲۳ مارچ ۱۹۸۵ء)۔

(۳) ان خطوط کا جرمن اور انگریزی متن ضمیمہ نمبر ۴ میں دیکھیے، جہاں مس ہوبوہم کے ٹائپ شدہ مسودے کے عکس درج کیے گئے ہیں۔ سوائے خط نمبر ۲ اور ۵، جو میری بیوی نے ٹائپ کیے ہیں، اور جن کے مخطوطوں کے عکس جناب ہوبوہم صاحب نے مہیا کیے تھے۔ (دُرانی ۲۳ مارچ ۱۹۸۵ء)۔

(۴) Pension Thurner, Schelling Str. 41, Munchen (منزل، پرائیوٹ ہوٹل =Pension)۔

(۵) Fraulein = Frl. Mein liebes Frl. Wegenast (فرائیلائین یعنی = Miss مس)۔

(۶) Kurzweilig کوتاہ عمر، زود گزر، مستعجل۔

(۷) اقبال ان خطوط میں عموماً یوں ہی تحریر کرتے ہیں۔ مثلاً مجھے ضرور لکھیے۔ میں نے اس کے ترجمے میں عموماً "خط" کا اضافہ کر دیا ہے۔

(۸) اصل خط کے عکس کے لیے دیکھیے ضمیمہ نمبر ۴

(۹) جس سے غالباً مراد اقبال کی طرف لکھا ہوا خط ہے۔

(۱۰) یہ میں لکھا ہے (Yours very sincerely)۔

(۱۱) اصل خط میں .Frl (Fraulien کا اختصار) ہے، یعنی مس Miss یہ طرز تخاطب اقبال نے اپنے تقریباً خطوط میں ملحوظ رکھا ہے چاہے وہ جرمن میں ہوں یا انگریزی میں۔ (دیکھیے ضمیمہ نمبر ۴)

(۱۲) Herr Reiner

(۱۳) [Kunst Ausstellung = Art exhibition] شاید موزخ کی آرٹ گیلری Atle [Pinakothek۔

(۱۴) Pension Schere یہ ہائیڈل برگ میں واقع ہے۔ جہاں اقبال جرمن زبان سیکھنے کے لیے مقیم تھے۔

(۱۵) Geduld=Patience حوصلہ، صبر، یارا۔

(۱۶) Angesiedelt= settled (یہ بامحاورہ زبان نہیں۔ غالباً اقبال نے کوئی لغت دیکھ کر ترجمہ کیا ہے)

(۱۷) اس پوسٹ کارڈ کا عکس فقیر سید وحیدالدین کی کتاب Iqbal in Pictures میں موجود ہے۔ اس کتاب میں پوسٹ کارڈ کی پشت کی تصویر بھی دکھائی گئی ہے اور وہاں پتہ یوں درج ہے: Frl. Emma Wegenast-16 Louisa (کذا) Str. Heilbronn (Germanny) یعنی Louisa نہ کہ Louisen (دیکھیے خط نمبر ۲ کا پتا۔) اس پوسٹ کارڈ کا عکس ضمیمہ نمبر ۴ میں ملاحظہ کیجیے۔

(۱۸) C/O Messrs Thomas Cook and Son, Ludgate Circus London- 2nd Dec.07 اصل مخطوطے کے عکس کے لیے دیکھیے ضمیمہ نمبر ۴

(۱۹) یہ لفظ صاف نہیں پڑھا جاسکتا۔ Lernen (سیکھنا) ہے۔ یا Lesen (پڑھنا)۔ اصل کے عکس کے لیے ضمیمہ نمبر ۴ دیکھیے۔

(۲۰) یعنی مسیوخ سے۔

(۲۱) Verderben یعنی بگاڑنا =to spoil یا to ruin (اگر Verbergen ہوتا تو اس کا مطلب to conceal یعنی چھپانا ہوتا)۔

(۲۲) Verdirbt=spoils or ruins جبکہ Verbirgt=conceals مترجم۔

(۲۳) یہ انگریزی میں لکھا ہے۔ (Yours sincerely)۔

(۲۴) C/O Messrs Thomas Cook and Son, Ludgate Circus London E.C.20th Jan.08

(۲۵) اقبال نے صرف Z۔ تحریر کیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ حرف Herz (جرمن=دل) کا آخری حصہ ہے۔

(۲۶) Emma۔

(۲۷) خط نمبر چھ کے بعد موجودہ خط کی تاریخ کچھ صحیح نہیں لگتی۔ یا ہو سکتا ہے وہ پہلی تاریخ غلط ہو۔

(۲۸) Friede=Peace (آشتی۔ امن و سکون)

(۲۹) یہاں Fraulein مکمل لکھا ہے۔

(۳۰) مس ویگے ناسٹ ان دنوں شاید Heilbronn میں ہوں گی۔ جو ہائیڈل برگ کے جنوب مشرق میں قریب تیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

(۳۱) مس عطیہ فیضی۔

(۳۲) اقبال نے انہیں ہندوستانی شہزادہ لکھا ہے۔ (مس فیضی اپنے بھائی ڈاکٹر فیضی کے ساتھ اگست ۱۹۰۷ء کے اواخر میں اقبال سے ملنے ہائیڈل برگ جا چکی تھیں۔ جہاں وہ مس ویگے ناسٹ سے متعارف ہوئی تھیں۔ (اقبال، از عطیہ بیگم۔ مترجمہ عزیز خالد۔)

(۳۳) Bitte = Please میں آپ سے درخواست کرتا ہوں۔

(۳۴) worter=Worte=words الفاظ۔

(۳۵) میرے اندازے میں اقبال جولائی کی آٹھ یا دس تاریخ کے لگ بھگ انگلستان سے روانہ ہوئے ہوں گے۔ (یکم جولائی کو انہیں بار ایٹ لاء کی ڈگری ملی۔ ۳ جولائی کو انھوں نے جناب F.W.Thomas صاحب کے نام اپنے مطبوعہ تھیسس (ایران میں علم مابعد الطبیعیات کا ارتقا) کا ایک نسخہ (لندن میں) معنون کیا۔ جواب میرے پاس ہے)۔ وہ ۲۷ جولائی کو لاہور پہنچے۔ اٹلی یا فرانس سے بمبئی تک کے جہاز کے سفر میں گیارہ سے تیرہ دن لگتے تھے۔ وہ بمبئی شاید ۲۴ یا ۲۵ جولائی کو پہنچ گئے ہوں گے۔

(۳۶) 49, Elsham Rd. Kensington W. London.

(۳۷) اقبال نے مس فیضی کو بھی لاہور سے کئی خط لکھے (مثلاً ۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۰ء میں) کہ عنقریب میں بمبئی کا سفر کروں گا اور آپ سے ملوں گا۔ لیکن مصروفیات (اور اپنے معروف تساہل) کی وجہ سے وہ اپنا وعدہ پورا نہ کر سکے۔ جہاں تک مجھے علم ہے اقبال عمر بھر دوبارہ جرمنی نہ جا سکے (اس

مجموعے کے خطوط نمبر ۲۱ تا ۲۷ بھی دیکھیے)

(۳۸) Herr Chanfer۔

(۳۹) Sialkot City India. 3rd Sep08.

(۴۰) Geregelt (Geregnet?=has rained) تحریر کردہ لفظ سیاق و سباق کے لحاظ سے بے معنی ہے۔

(۴۱) Lahore (India), 11th Jan.09.

(۴۲) erwachsenen=Erwachsene =بالغان۔

(۴۳) aus der Bahnhof uber dem weg یہ جملہ بامحاورہ نہیں ہے۔

(۴۴) Ansicht=view مطمح نظر؟

(۴۵) es alles gut sein wurden یہ جملہ بامحاورہ نہیں ہے۔

(۴۶) Herr Chaubal شاید یہ خط نمبر ۱۱ (مورخہ ۲۷ جون ۱۹۰۸ء) والے جناب Chaufar یا Chanfer ہی ہیں۔ اگرچہ ان دو جگہوں پر لکھائی میں بھی مختلف ہیں۔

(۴۷) خط میں جرمن زبان کا یہ فقرہ خلافِ محاورہ ہے۔

(۴۸) Deutschland uber alles=Germany above all ("جرمنی سب سے اونچا" یا "جرمنی کا بول بالا")۔

(۴۹) یہاں پورا لفظ Fraulein (=مس) لکھا ہے۔

(۵۰) Idealen=Ideale=(=Ideals)

(۵۱) اگر اقبال اتنی باقاعدگی سے تقریباً ہفتہ وار مس ویگے ناسٹ کو خط لکھتے تھے۔ تو ظاہر ہے ان میں سے بہت سے محفوظ نہیں رہے۔

(۵۲) غالباً اس خط کے ساتھ اقبال نے ایک پوستین تحفتاً بھیجی ہوگی۔

(۵۳) یہاں پورا لفظ Fraulein (=مس) لکھا ہے۔

(۵۴) terrible=schrecklish=خوفناک، بدا۔

(۵۵) Cravaten [=Krawatte]=ties, scarves

(۵۶) Fader [=Feder] قلم۔

(۵۷) اقبال نے یہاں miserable لکھا ہے جو جرمن زبان کا لفظ نہیں ہے۔

(۵۸) گھر سے غالباً اقبال کی مراد ہائیڈل برگ کے ہوسٹل Pension Scherer سے ہے (دیکھیے: خط نمبر ۳)

(۵۹) اس خط پر اقبال کا پتا درج نہیں ہے۔ غالباً یہ تحریر ایک پوسٹ کارڈ پر ہے۔ جامع مسجد دہلی کا ایک ایسا ہی (غیر مطبوعہ مخطوطہ) پوسٹ کارڈ میرے پاس موجود ہے، جو اقبال نے ۱۹۰۹ء میں اپنے استاد پروفیسر طامس آرنلڈ کو لندن بھیجا تھا۔

(۶۰) غالباً اپنی شدتِ جذبات کے اظہار کے لیے اقبال نے یہ خط انگریزی میں لکھا ہے۔ اور ایک دفعہ انگریزی شروع کی تو پھر بعد کے سارے خطوط اسی زبان میں تحریر کیے ہیں۔

(۶۱) یہاں پہلی مرتبہ Miss لکھا ہے۔ (یعنی Dear Miss Wegenast)۔

(۶۲) اقبال نے یہ آیت انگریزی ترجمے میں لکھی ہے:

Verily we are for God and to God we return.

(۶۳) May God be with you.

(۶۴) Yours ever۔

(۶۵) اگرچہ یہ اور اس کے بعد کے سب خطوط انگریزی میں ہیں، تاہم اقبال نے عموماً طرزِ تخاطب جرمن زبان ہی کا برقرار رکھا ہے۔ یعنی My dear Frl. Wegenast۔

(۶۶) انیسویں صدی کا جرمن شاعر۔

(۶۷) Good old Lady!

(۶۸) اس خط کے چند ہفتوں بعد ہی (یعنی آغاز اگست ۱۹۱۴ء میں) جنگ عظیم چھڑ گئی۔ اور نہ صرف علامہ اقبال کے منصوبے پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکے۔ بلکہ ان کی خط و کتابت مس ویگے ناسٹ کے ساتھ پانچ سال کے لیے منقطع ہو گئی۔

(۶۹) Master=استاد، مرشد، صاحبِ ہنر۔

(۷۰) پہلی جنگِ عظیم نومبر ۱۹۱۸ء میں بند ہو گئی تھی۔ مگر انگلستان اور جرمنی میں صلح نامے پر دستخط ۲۸ جوان ۱۹۱۹ء کو ہوئے تھے۔

(۷۱) یہاں Brothers (برادران) لکھا ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے خط میں انھوں نے صیغۂ واحد میں بھائی لکھا ہے۔

(۷۲) یعنی لندن، جنوب مغرب۔

(۷۳) علامہ اقبال ان دنوں دوسری گول میز کانفرنس کے سلسلے میں لندن میں قیام پذیر تھے، جہاں وہ ۲۷ ستمبر کو پہنچے تھے۔

(۷۴) غالباً انہی صاحب کا نام عطیہ بیگم کی کتاب "اقبال" (مترجمہ عبدالعزیز خالد، ص ۱۹) میں ملتا ہے، جہاں اس کے بچے Metztroth ہیں۔

(۷۵) یعنی گول میز کانفرنس کے مندوبین کو۔

(۷۶) 3A, St. James's Court, Buckingham Gate, SW1.

(۷۷) N.W.I. یعنی شمال مغربی لندن ۱۔ یہ سہو قلم ہے، S.W.I ہونا چاہیے تھا۔

(۷۸) دوسری گول میز کانفرنس کے خاتمے سے چند روز پیشتر ہی علامہ روانہ ہو گئے جہاں وہ ایک ہفتہ ٹھہرے۔

(۷۹) Signor Marconi۔

(۸۰) رستے میں علامہ قاہرہ میں رکتے ہوئے یروشلم پہنچے۔

(۸۱) خط کی پیشانی پر علامہ کا نام اور پتہ تحریر ہے۔

(۸۴) علامہ ۲۸ دسمبر ۱۹۳۱ء کو بمبئی پہنچے تھے، جہاں بیگم عطیہ فیضی نے ان کے اعزاز میں اپنے یہاں ("ایوان رفعت" میں) ایک دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ مختصر قیام کے بعد وہ اسی شام ٹرین سے لاہور روانہ ہو گئے تھے، جہاں وہ ۳۰ دسمبر کی صبح کو پہنچے۔

(۸۳) Painful happiness۔

(۸۴) Queen Anne's Mansions, St. James's Park, London SWI.

(۸۵) علامہ اقبال تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ وہ بمبئی سے جہاز پر وینس تک سفر کرنے کے بعد وینس سے ٹرین کے ذریعے پیرس روانہ ہوئے، اور پھر وہاں رکنے کے بعد گاڑی سے اوائل نومبر ۱۹۳۲ء میں لندن پہنچے۔ یہ کانفرنس ۱۷ نومبر کو شروع ہوئی تھی۔

(۸۶) 14. Staubėn Str.

(۸۷) Bayerischer Hof یعنی انگریزی کے مطابق Bavaria Court Hotel

(۸۸) لیکن اگلا خط بھی دیکھیے۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

(۸۹) Conte Verdi۔

(۹۰) Md. Iqbal۔

(۹۱) سید امجد علی علامہ کے ساتھ اسپین جانا چاہتے تھے۔ لیکن ایک روایت کے مطابق ان کی ناک میں پھنسی نکل آئی اور وہ نہ جا سکے ہاں اس سفرِ ہسپانیہ میں ایک لیڈی سیکرٹری ضرور علامہ کے ہمراہ تھی۔ (دیکھیے اس کتاب میں میرا مضمون "ہسپانیہ میں علامہ کے نقشِ قدم پر"۔ ص ۱۷۷)

انجمن کی تازہ مطبوعات

نام کتاب	مصنف	قیمت	صفحات
(۱) نیاز فتح پوری شخصیت اور فن	ڈاکٹر عقیلہ شاہین	۲۰۰/-	۴۰۰
(۲) غالب کا سائنسی شعور	ڈاکٹر سید حامد علی شاہ	۷۵/-	۱۵۲
(۳) انتخاب کلام ناسخ	رشید حسن خاں	۱۲۰/-	۳۳۰
(۴) ہماری زبان، مباحث و مسائل	پروفیسر طاہر فاروقی	۷۵/-	۱۶۰
(۵) اقبال اور ان کا پیغام	پروفیسر رالف رسل	۱۰/-	۲۴
(۶) غالب کے خطوط (حصہ چہارم)	ڈاکٹر خلیق انجم	۱۵۰/-	۳۸۳
(۷) رباعیات عجائبات	امو جان ولی دہلوی	۵۰/-	۸۰
(۸) اقوال و امثال	سید یوسف بخاری	۴۵۰/-	۱۰۰۸
(۹) جدید اردو شاعری (حصہ دوم)	عزیز حامد مدنی	۱۷۵/-	۴۶۴
(۱۰) زبانِ واحد	میرین مولٹینو اصفیہ صدیقی	۱۰۰/-	۱۸۴
(۱۱) مشاہیر یونان و روما (حصہ پنجم)	پلوٹارک اسید ہاشمی فرید آبادی	۱۱۰/-	۲۷۰
(۱۲) اردو تنقید کا ارتقاء	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۱۵۰/-	۴۴۸
(۱۳) پنجابی کے پانچ قدیم شاعر	شفیع عقیل	۹۰/-	۳۱۲

اقبال کیسا نظامِ حکومت چاہتے تھے

ڈاکٹر عبدالغفار کوکب

علامہ اقبال معدودے چند خوش نصیب ادبا اور شعرا میں سے ہیں جن کی شہرت ان کی زندگی ہی میں چار دانگ عالم میں پھیل گئی تھی اور ان کی فکری اور شعری کاوشوں کو نہ صرف مشرق بلکہ مغرب میں بھی سراہا گیا تھا۔ ان کے اسی فکری اثاثے نے انھیں لاثانی حیثیت دے کر آفاقی شاعر اور مفکر بنا دیا ہے اور انھیں خراجِ تحسین پیش کر کے عظیم فلسفی کے مقام تک پہنچا دیا ہے۔ ان کے کلام اور نثری تحریروں کا مطالعہ کرنے سے بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاید صرف مسلمانوں کو ان کے مقام سے آشنا کرنا چاہتے ہیں اور انھیں صرف مسلم معاشرے کی بقا کی فکر ہے لیکن اگر ہم بغور مطالعہ کریں اور گہرائی میں جائیں تو پتا چلتا ہے کہ ان کا موضوع سخن صرف مسلمان ہی نہیں ہیں۔ بلکہ وہ بنی نوع انسان کی بقا چاہتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ انھیں اس بات کی بڑی فکر تھی کہ مشرقی اقوام کی آنکھیں مغرب کی ظاہری چمک دمک سے چندھیا گئی ہیں اور اس احساس کمتری نے انھیں مزید پاتال کی طرف دھکیل دیا ہے انھوں نے جہاں اہلِ مشرق کو مغرب کی ظاہری چکاچوند سے بچانے کی کوشش کی وہیں انھیں اس امر کی تلقین بھی کی کہ وہ مغرب کی مادی خوشحالی اور ذہنی و سائنسی ترقی کی وجوہات بھی معلوم کریں۔

اقبال کی فکر اور فلسفے کو جہاں تحسین کی نظر سے دیکھا گیا ہے وہیں ان پر تنقید بھی کی گئی ہے۔ سب سے زیادہ تنقید ان کے فلسفۂ خودی اور ان کے نظامِ حکومت پر کی گئی ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ نقادوں کے اس اعتراض کے بعد کہ اُن کا فلسفۂ خودی صرف مسلمانوں کے لیے جہانِ نو کا پیغام دیتا ہے کس حد تک حقیقت پر مبنی ہے۔ یہ درست ہے کہ اقبال مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے بہت بڑے پیامبر تھے اور ان کی فکری اساس قرآن اور سنت نبوی صلعم پر ہے ان کے فلسفۂ خودی میں بھی عشق و عقل کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اقبال دراصل عقل کے خلاف نہیں تھے بلکہ وہ اس عقل کے خلاف تھے جس نے انسان کو مشین بنا کے رکھ دیا ہے اور اس عقل نے دنیا کو خاص کر مغرب کی ترقی یافتہ اقوام میں رعونت سے فرعونیت پیدا کر دی ہے۔ اقبال کے فلسفۂ خودی سے متعلق عبدالرحمن لکھتے ہیں:

> اقبال کے فلسفۂ خودی کا نقطۂ عروج خودی کی نشوونما کے ذریعے افراد کے کردار کی تعمیر ہے۔ اقبال کا واضح مقصد فوق البشر کی ایک ایسی نسل تیار کرنا ہے جو عقل کے ذریعے عناصر پر لامحدود غلبہ و اقتدار حاصل کر کے اور ساتھ ہی یہ بھی وسیلۂ وجدان یا تعلق باللہ خدائی مقاصد سے بھی سرشار ہو۔ وہی انسان اس زمین پر خدا کی خلافت کے مستحق ہوں گے۔ نہیں۔ بلکہ یہ زمین و آسمان ان کی میراث بن جائیں گے۔ انھوں نے ایسے مردِ کامل کا تصور بھی پیش کیا ہے۔ جس کی بلند شخصیت

لبنی بے پناہ کشش سے راہِ نجات یا صراطِ مستقیم پر دوسروں کی رہنمائی کرے گی۔ یہ ان کا نظریۂ رسالت ہے ___

اقبال کا کہنا یہ ہے کہ خودی کو بقائے دوام کی ضمانت خود بخود نہیں ملتی بلکہ جدوجہد سے حاصل کی جاتی ہے یہاں یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ بقائے مدارج کا انحصار خودی کی جدوجہد پر ہے کیوں کہ یہ بات ظاہر ہے کہ کوئی وجود عقلاً معدوم نہیں ہو سکتا فنائے کامل ایک لایعنی شے ہے اور برگساں کا یہ قول درست ہے کہ عدم محض کا تصور ناممکن ہے۔ اس کائنات کے معرضِ وجود میں آنے سے پیشتر یقیناً کوئی نہ کوئی نظامِ ہستی رہا ہو گا کیوں کہ عدم کا تصور ناممکن ہے اور یہ دلیل بقائے خودی کے لیے بھی مساوی طور پر کار آمد ہے۔(۱)

اقبال کا فلسفۂ خودی ہو یا نظریۂ فوق البشر یا نظامِ حکومت یہ آپس میں باہم اس طرح مربوط ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی علاحدہ کر کے ان نظریات سے پوری طرح بہرہ مند نہیں ہوا جا سکتا۔ خودی (جو اپنی ہستی کی پہچان ہے) کی منزل تک پہنچنے کے لیے اطاعتِ الٰہی، ضبطِ نفس اور رجائیت کی ضرورت ہے۔ جب یہ تینوں اوصاف انسان میں اکٹھے ہو جاتے ہیں تو پھر وہ نیابت الٰہی کا حقدار ٹھہرتا ہے اور انسانِ کامل کہلاتا ہے اور یہ اس وقت ممکن ہے جب وہ عقل و خرد سے بے گانہ نہ ہو جب انسان نیابت الٰہی کے منصبِ جلیلہ پر پہنچ جاتا ہے تو پھر وہ خود تقدیرِ یزداں بن جاتا ہے اور خدا اس کائنات کا نظام اس کے تابع کر دیتا ہے۔

اقبال کے نزدیک اسلام ایک بہترین تصورِ مملکت کا نظریہ پیش کرتا ہے بہترین ضابطۂ حیات رکھتا ہے۔ انھوں نے دنیا میں رائج مختلف نظاموں کا تجزیہ کر کے ان کی خامیوں کو اجاگر کرتے ہوئے ان کا اسلامی نظامِ حکومت سے تقابل کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ انسانی معاشرے کی بقا صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم اسلام کے بتائے ہوئے اصولوں پر پوری طرح کاربند ہو جائیں۔ وہ رنگ و نسل، قبیلہ اور خاندان کی باہمی آویزش اور اقوام کی ایک دوسرے کے ساتھ عصبی مخاصمت کا واحد حل اسلامی نظام میں پوشیدہ ہے چناں چہ خود کہتے ہیں کہ:

اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

اقبال نے بطور ایک فلسفی اور سیاست دان کے دنیا کی مختلف تہذیبوں کا مطالعہ کیا تھا۔ وہ مغربی تہذیب کی مادر پدر آزادی کے سخت مخالف تھے لیکن یہ سمجھ لینا کسی طور پر درست نہ ہو گا کہ وہ انسان کی ترقی کے خلاف تھے ہرگز نہیں۔ وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ زمانے کی رفتار کا ساتھ نہ دینے والی اقوام صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہیں لیکن وہ اس بے راہ روی کے سخت خلاف تھے جس نے انسانی اقدار کو ملیامیٹ کر دیا تھا اور انھیں اس امر کا بہت پہلے سے احساس ہو گیا تھا چناں چہ آج مغربی تہذیب جس قعرِ مذلت میں گرفتار ہے اس کے متعلق تو انھوں نے نہایت واضح طور پر کہا تھا کہ تمھاری تہذیب خود اپنے خنجر سے تمھارا گلا گھونٹ کر رکھ دے گی۔ عبدالرحمن طارق اسی بات کو مزید واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"دنیا کا موجودہ انتشار اور مغربی تہذیب و تمدن کا وہ عبرتناک مآل جسے ہم آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں علامہ مرحوم کے مذکورہ بالا تاثرات کی بیّن تصدیق پیش کر رہا ہے۔ محسوس ایسا ہو گا کہ اقبال ایک عارف اور مجدّد کی مانند اپنے آئینہ دل میں بیٹھے ہوئے مستقبل کے واقعات اور حوادث کو بآسانی دیکھ رہا تھا اور پھر اپنے آئینہ گفتار میں ہمارے سامنے ان واقعات کی دھندلی سی تصویر پیش کر رہا تھا۔ آج یہ تصویر اپنے باریک سے باریک نقوش کو پوری تیزی سے ابھار کر ہمارے

سامنے آگئی ہے اور ہر فردِ بشر اس لادین سیاست کی موت کا منتظر تھر تھرا کر دیکھ رہا ہے جو اپنی ہوس پرستی اور درندگی کی بنا پر دنیا کی تمام مخلوقات کے لیے عذاب بن رہی تھی۔"(۲)

اقبال نے ایک سیاستدان کے طور پر سوشلزم، کمیونزم، ملوکیت، بادشاہت، جمہوریت الغرض ان تمام نظام ہائے حکومت کا مطالعہ کیا، جانچا اور پرکھا تھا۔ اگرچہ ان تمام کا نظریۂ انسانیت کی فلاح و بہبود تھا لیکن انھیں ان تمام نظاموں میں اپنی کوئی تسلی بخش امرت دھارا جیسی دوا نہیں ملی جو دنیا کے افلاس زدہ لوگوں کی درماندگی کو ختم کر سکے ان میں بے پناہ نقائص نے ان انفرادی خوبیوں کو بھی گہنا کر رکھ دیا ہے جن کی اساس پر یہ نظام قائم کیے گئے تھے مثلاً اشتراکیت، فرد کو اس کی بنیادی ضروریات، مملکت کا فرض کا نعرہ لے کر آئی تھی۔ اس پُرکشش نعرہ نے ایک عرصہ تک دنیا کے ایک بڑے حصے کو اپنے سحر میں گرفتار رکھا لیکن ایک صدی سے بھی کم عرصہ میں یہ نظام اپنی ظاہری چکاچوند کے باوجود زمین بوس ہو گئی ہے۔ اس کا سب سے بڑا تجربہ روس اور اس کے حاشیہ نشیں ممالک میں کیا گیا تھا۔ ابتدا میں یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ انقلابی پروگرام شاید جلد ہی ساری دنیا میں پھیل جائے گا۔ اس نظام نے فرد کو روٹی، کپڑا اور مکان کی ضرورت سے تو بے نیاز کر دیا لیکن ساتھ ہی روح کی بیداری اور ضمیر کی آزادی بھی چھین لی۔ وہاں کے عوام نے ان جابرانہ اقدام کے خلاف پہلے پہل دبا دبا پھر بھرپور احتجاج کیا۔ آج اگرچہ چین اور دیگر ممالک میں یہ نظامِ حکومت جاری ہے لیکن اب یہ ممالک بھی اصلاحات کے نام سے ان میں بہت سی تبدیلیاں کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں اور یوں سوشلزم کی اصل شکل کہیں راستے میں گم ہو گئی ہے اور پھر کون جانے کہ موجودہ صورت بھی کب تک قائم رہتی ہے اشتراکیت کی طرح آمریت اور شہنشاہیت بھی انسان سے فکر و نظر کی قوت چھین لیتی ہے اور فرد کی حیثیت ریاست میں شطرنج کے مہروں سے زیادہ نہیں ہوتی اگر ہو بھی تو وہ بے حیثیت ہو گی بلکہ زیادہ صحیح طور پر برائلر کی مانند ہوتے ہیں جن میں گوشت تو ہوتا ہے لیکن سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری ہوتے ہیں۔ یہ مطلق العنانیت جہاں کاسہ لیسوں کو ابھارتی ہے وہیں رفتہ رفتہ نااہلوں کی فوج ظفر موج تیار کر لیتی ہے یہ جی حضوریے ساون کے اندھوں کی مانند ہمیشہ سبز ہی دیکھتے ہیں انھیں صاحبانِ اقتدار کا ہر قدم عوام کی فلاح کی طرف اٹھتا دکھائی دیتا ہے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ صاحب الرّائے لوگوں کی کمی، کم ہوتے ہوتے قریب الاختتام تک پہنچ جاتی ہے۔ جمہوریت اور آمریت آج کا سب سے مقبول طرزِ حکومت ہے دنیا کے بیشتر ممالک یہی نظام اپنائے ہوئے ہیں حتیٰ کہ وہ ممالک بھی جو روایت پسند ہیں انھوں نے "تاج" کو محض ایک علامت کے طور پر برقرار رکھا ہوا ہے۔ جمہوریت کی خوبیوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا بھلا جس کا نعرہ ہی عوام کی حکومت، عوام کے ذریعے ہو اس کی افادیت کو کیسے جھٹلایا جاسکتا ہے۔ اس خوش کن نعرے کی دل آویزی بھی شک و شبہ کی گنجائش پر ہے۔ اقبال کا خیال یہ ہے کہ یہ ایک ایسا نظامِ حکومت ہے جس میں بندوں کو گنا جاتا ہے تولا نہیں جاتا۔ وہ جمہوریت کی آڑ میں معاشرے کی مادر پدر آزادی کے بھی سخت خلاف ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اس بے ہنگام آزادی نے فرد کو معاشرے سے بیگانہ کر کے رکھ دیا ہے اور اس سے ہماری اخلاقی اقدار کی جڑیں کھوکھلی ہو کر رہ گئی ہیں اس بے لگامی کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مغرب کی اس خیرہ کر دینے والی ترقی اور چکاچوند نے بظاہر انسان کو آسائش تو مہیا کر دی ہے اور زندگی کو آسان بھی بنا دیا ہے لیکن اس سے وہ حس چھین لی ہے جو اسے اشرف المخلوقات کے درجے تک پہنچا دیتی ہے۔ جمہوریت کی طرح سیکولر نظام حکومت کا پرچار بھی بڑے زور و شور سے کیا جا رہا ہے اس نظریہ کے حامیوں کا کہنا ہے کہ مذہب انسان اور خدا کا ذاتی معاملہ ہے۔ ریاست کو اس میں دخل اندازی کا کوئی حق نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس اندازِ فکر سے ہمیشہ جارحیت اور امن شکنی کے دروازے کھلتے ہیں اور انسان خوفِ خدا سے بے نیاز ہو کر گمراہی کے راستے پر چل نکلتا ہے جو آگے چل کر ظلم و بربریت کی ہولناک داستانوں کو جنم دیتا ہے بلکہ بہت سے ممالک نے تو سیکولرازم کا لبادہ اوڑھ کر سادہ لوح اقلیتوں کو بھٹکانے کا فریضہ ادا کرنے کے علاوہ کچھ نہیں دیا۔ زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں ہمارے ہمسایہ

ملک بھارت کی مثال سامنے ہے جو سیکولرازم کا بہت بڑا دعوے دار ہے لیکن ملک کے کسی نہ کسی حصے میں ہر وقت فرقہ وارانہ فسادات کی آگ پھیلی رہتی ہے اور افسوس ناک امر تو یہ ہے کہ اس میں ہمیشہ اقلیتی فرقے ہی خسارے میں رہتے ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اقبال کس قسم کا نظام چاہتے تھے۔ آئیے اس سلسلے میں اقبال کے شیدائیوں کی آرا ملاحظہ کریں:

"اقبال کا یہ خیال اور بلکہ یقین ہے کہ نظامِ حکومت خواہ کوئی ہو، جمہوریت ہو، آمریت ہو یا بادشاہت ہو اگر سیاست کا کھیل مذہب اور خوفِ خدا سے مشروط نہ ہو تو دنیا میں امن برقرار نہیں رہ سکتا۔ لادین سیاست، سیکولر ریاست، ہمیشہ جارحیت اور امن شکنی کے راستے پر گامزن ہوتی ہے۔ یہ قدرت کا فیصلہ ہے یہ انسان کی خوفِ خدا سے بے نیاز اور گمراہ انسان کی فطرت ہے۔

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اقبال کے اس خیال کی تائید انسان کی حالیہ تاریخ سے ہوتی ہے یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں کبھی اس قدر عالم گیر اور وسیع پیمانے پر تباہی اور بربادی نہیں ہوئی جس قدر موجودہ صدی عیسوی میں ان اقوام کے درمیان آویزش اور ہلاکت خیز جنگوں سے برپا ہوئی ہے جو اپنے آپ کو سیکولر نظامِ سیاست پر کاربند سمجھتی ہیں جو اپنے نظام سیاست سے مذہبی عنصر اور خوفِ خدا کو بے دخل کر دینے پر فخر محسوس کرتی ہیں:

اقبال جس قسم کے نظامِ سیاست کو رائج دیکھنا چاہتا ہے اس میں دین و سیاست کے جھگڑے، وطنیت، رنگ و نسل پر مبنی قومیت، سیکولر جمہوریت یا طحد اشتراکیت کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ اقبال کے نزدیک پسندیدہ نظامِ حکومت "خلافت" ہے بشرطیکہ اجتہاد اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق اصولِ دین کی تشریح کے دروازے کھلے رکھے جائیں۔(۳)

اسی خیال کو آگے بڑھاتے ہوئے سر انصاری لکھتے ہیں:

اقبال اپنی مثالی مملکت میں سیاست کو مذہب و اخلاق سے الگ نہیں رکھنا چاہتے ہیں۔ نشاۃ ثانیہ کے بعد کے یورپ کی سیاسی تصویر جو انھوں نے کھینچی ہے، اس میں میکاولی کے نظریے کے ساتھ ساتھ ہوس کی امیری اور ہوس کی وزیری کا بھی پردہ چاک کیا ہے۔

اقبال مملکت کو ایسا ادارہ سمجھتے ہیں جس سے انسانی فلاح و بہبود کا کام لیا جا سکے۔ وہ مملکت کو مقصود بالذات نہیں سمجھتے۔ وہ اس نظریے کے قائل نہیں کہ مملکت کو الوہیت کا درجہ دے دیا جائے اسی طرح اقتدارِ اعلیٰ کے سلسلے میں بھی ان کا نقطۂ نظر یہ ہے صرف خدا ہی مقتدرِ اعلیٰ ہو سکتا ہے ـــــ یہاں پہنچ کر ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اقبال نے اقتدارِ اعلیٰ کو ذاتِ خداوندی سے کیوں منسوب کیا ہے خدا سے وفاداری کا مطلب یہ ہے کہ درحقیقت انسان خود اپنی مثالی فطرت سے وفاداری کر رہا ہے اس لیے وہ ایک سچے مسلمان کی شان یہ سمجھتے ہیں کہ وہ کسی فرعون کے سامنے سر نہ جھکائے۔

اقبال اپنی مثالی مملکت میں کسی سیاسی نظام یا سیاسی جماعت کو اقتدارِ اعلیٰ سونپنے کے لیے تیار نہیں وہ سمجھتے ہیں کہ سروری صرف خدا کو زیب دیتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ چوں کہ

انھوں نے انسان کی مثالی فطرت پر زور دیا ہے اس لیے افلاطون کی طرح وہ بھی مثالی انسان کو مملکت کا حکمران بنانے کے حق میں ہیں۔ افلاطون کا مثالی انسان فلسفی ہے اور اقبال کا مثالی انسان مردِ مومن۔ اقبال غیر حق کے ہاتھوں میں عنانِ حکومت نہیں دینا چاہتے بلکہ عدل و انصاف کی اقدار کے امین اور محافظ کو حقیقی حکمران سمجھتے ہیں کیوں کہ ان کے نظریے کے مطابق عدل و انصاف سے روگردانی کرنے والا حکمران ضعیف اور ناتواں کے لیے قاہر اور جابر ثابت ہوتا ہے۔

اقبال اپنی مثالی مملکت میں آزادی اور حریت کو بنیادی شرط قرار دیتے ہیں۔ پھر اتحاد، یک جہتی اور اتفاق کے ساتھ سماجی انصاف اور معاشی عدل کو ضروری سمجھتے ہیں اس مقصد کے حصول کے لیے اقبال نے اپنی زندگی کے سارے شعبوں کا جائزہ لیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ کس طرح ایک ملت ایک مثالی مملکت میں رہ کر اپنے وقار اور عظمت میں اضافہ کر سکتی ہے۔ (۴)

درج بالا مفکرین کی رائے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اقبال شاید جمہوریت کے بھی اسی قدر مخالف تھے جتنے کہ اشتراکیت، ملوکیت اور آمریت کے یہ درست ہے کہ وہ مغربی جمہوریت کو بھی آمریت کی بدلی ہوئی شکل ہی سمجھتے تھے لیکن اس نظام کی تمام تر خامیوں کے باوجود انھوں نے جابجا یہ اظہار بھی کیا ہے کہ وہ جمہوریت کو نسبتاً بہتر طرزِ حکومت سمجھتے ہیں اور اسے کسی حد تک قابلِ عمل بھی گردانتے ہیں۔ اقبال کے اسی خیال کی وضاحت کرتے ہوئے رعنا اقبال لکھتی ہیں:

اقبال در حقیقت ظاہر سے زیادہ باطن، جسم سے زیادہ روح اور ذات سے زیادہ جوہر کی اہمیت کے قائل ہیں اس لیے وہ نظامِ حکومت کو اس کی ہیئت ترکیبی کی روشنی میں نہیں دیکھتے بلکہ انسانی نقطۂ نظر سے اس کے مقاصد، کارکردگی اور نتائج کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ اقبال ملوکیت، آمریت اور اشتراکیت کو یکسر رد کر دیتے ہیں لیکن جمہوریت کو بھی وہ تمام خامیوں سے مبرا اور مثالی طرزِ حکومت نہیں سمجھتے اس لیے اس کی خامیوں، کوتاہیوں کی طرف بار بار توجہ مبذول کرواتے ہیں۔ اس میں دو باتوں کا اضافہ اور کیا جاسکتا ہے ایک یہ کہ اقبال کے ہاں ایک رجحان ہیرو پرستی کا بھی پایا جاتا ہے اسی لیے وہ سیاسی قائدین اور عوامی نمائندوں کو بھی پُرقوت اور باکردار دیکھنا چاہتے ہیں لیکن یہ فاشزم کے رجحان سے مختلف چیز ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ کسی بھی نظامِ حکومت، آئین یا اسمبلی کو تمام حدود و قیود سے آزاد یا بالاتر نہیں کرتے۔ ان کے ہاں ہر عمل یا طریقہ خدا ترسی سے مشروط ہے۔ یہ بات تو اس عہد کا ہر صاحب فہم انسان تسلیم کرتا ہے کہ غیر مشروط اور بے حجاب آزادی اپنا کوئی مطلق وجود نہیں رکھتی اور اگر رکھتی ہے تو یہ انسانی معاشرے اور تمدن کے لیے سودمند نہیں ہو سکتی اقبال نے دراصل اسی خیال یا تصور کو اپنے نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے۔ حکمران یا حکمرانوں کا ایک خاص حد میں رہنا ضروری ہے ورنہ مغربی جمہوری ممالک میں پارلیمنٹ کو مقتدر اعلیٰ سمجھتے ہوئے بعض ایسے قوانین وضع کیے گئے ہیں جنھیں انسانی سماج، انسان اور تمدن کے لیے کسی طرح مفید قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر مرد اور عورت کے جنسی عمل کی نمائش اور امرد پرستی کے حق کے قوانین۔ مختصر یہ کہ جمہوریت اور جمہوری نظام پر اقبال نے جو اعتراضات کیے ہیں وہ بھی خالص انسانی اور جمہوری نقطۂ نظر سے کیے گئے ہیں یہ نکتہ بہت اہم ہے

جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے محض ادھر ادھر سے یا سرسری طور پر نظر ڈالنے سے اقبال کی فکر
اور اس کے مضمرات پوری طرح روشن نہیں ہو سکتے۔(۵)

دورِ جدید میں مروّج ان نظاموں کی خامیوں کا جائزہ لینے کے بعد اقبال نے اسلام کا ایک مثبت معاشرتی نظریہ پیش کیا ہے ایک ایسا نظریہ جس میں سوشلزم کی طرح مساواتِ شکم کی بجائے مساواتِ ارواح پر زور دیا گیا ہے۔ جمہوریت کی گنتی کی بجائے معاشرے کو جزو کی بجائے کل سمجھا گیا ہے۔ محبت، اتحاد اور یگانگت کو اس عقیدہ کا نصب العین سمجھا گیا ہے اور یہ اس وقت حاصل ہو سکتا ہے جب انسان ہدایت الٰہی سے رسولِ عربی صلعم کے اسوہ حسنہ پر چلنے کی کوشش اور سعی کرے اسلام کے اخلاقی اور سماجی افکار تمام ایمان والوں کو ایک ایسی برادری میں مربوط کر دیتے ہیں جن میں معاشی ناہمواریوں کے باوجود ہر ایک سب کی بہبود کا خواہاں ہوتا ہے۔ اقبال طبقاتی تقسیم کی بجائے مساوات اور سالمیت کا درس دیتے ہیں وہ ایک ایسے نظام کے داعی ہیں جس میں معاشرے کے ہر فرد کے لیے ترقی کے یکساں مواقع ہوں۔ جس میں امیر و غریب کے لیے علاحدہ قوانین نہ ہوں۔ کسی کی عزت نفس مجروح نہ ہو۔ شاید اسی لیے وہ عصرِ حاضر کی فکر و تہذیب کے آشیانہ کو ناپائیدار قرار دیتے ہیں کہ اس کی تعمیر میں حقیقتِ کل کے ادراک کی بجائے "جز" کے خوردبینی مشاہداتی طرزِ فکر کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اقبال کے نزدیک "حقیقت کل" خدا کی ہستی کو ایک فعل، بہ ارادہ دائمی قوت کی حیثیت سے کائنات میں فرماں روا تسلیم کر لینے کا نام ہے۔ اس لیے اقبال زندگی کی تمام فکری اور پچھلی راہوں کو اس ہدایت کی روشنی میں اجاگر کرتے ہیں جو ان کے نزدیک حقیقت کل کے ادراک و شعور کا واحد سرچشمہ ہے۔ اقبال صرف خدا کے رسولوں کو ہی وہ ذریعہ تسلیم کرتے ہیں جن کی وساطت سے ابدی اور کلی سچائی حاصل ہو سکتی ہے۔ عقل کا صحیح مقام، اپنی ان حدود کا اعتراف و ادراک ہے جس کے بعد مجرد ذہنی کاوش سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ حقیقتِ کل کا احساس و ادراک صرف عشق کے ذریعے ممکن ہے۔ اس طرح اقبال کا عشقِ رسول دراصل ایک اہم فلسفیانہ حقیقت قرار پاتا ہے وہ اپنی مثالی مملکت میں سیاست کو مذہب و اخلاق سے الگ نہیں رکھنا چاہتے۔ وہ یہ سمجھتے اور اقوامِ عالم کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ جب تک ہم دین اور سیاست کو باہم یکجا کر کے ایک مربوط نظام کی بنیاد نہیں رکھیں گے اس دنیا میں امن کا خواب ایک دیوانے کی بڑ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ آج دنیا جن مسائل اور معائب میں گرفتار ہے اس قعرِ مذلت سے نکلنے کا واحد رابطہ دینِ حنیف کی پیروی ہے۔ اقبال ایک رجائیت پسند شاعر اور فلسفی تھے۔ وہ جدید تہذیب سے متنفر ہونے کے باوجود اصلاح کے امکانات سے مایوس نہیں تھے۔ تاہم وہ یہ سمجھتے تھے کہ جتنا جلد ممکن ہو جدید تہذیب کے ان گندے انڈوں کو اٹھا کر باہر پھینک دینا چاہیے۔ ان کے اس مربوط نظام سے متعلق سیدہ عظمیٰ گیلانی لکھتی ہیں:

اس امر میں شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ اقبال کے افکار محض نظری، فلسفیانہ مباحث تک ہی محدود نہیں ہیں ان کے افکار کا ایک معاشرتی اور عملی پہلو بھی ہے۔ یہ معاشی، معاشرتی اور عملی پہلو ہی ان کے غور و فکر کی اصل غرض و غایت ہے۔ صرف منطقی بحثوں میں الجھے رہنا مقصود نہیں۔ علامہ کے افکار کے اجزا ان کے اشعار میں بکھرے پڑے ہیں اگر ان کو یکجا کر کے ایک خاص ترتیب سے مطالعہ کیا جائے تو ایک صاف ستھرے صحت مند اور برائیوں سے پاک معاشرے کا ڈھانچہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ علامہ کے پیش کردہ نظامِ حیات عمومی حیثیت سے تمام بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لیے ہے مگر ان کے مخاطب خصوصی طور پر مسلمان ہیں جن کی پسماندگی اور زبوں حالی انھیں خون کے آنسو رلاتی ہے۔(۶)

اقبال کے نظریہ حیات کی بنیاد جو انھیں دیگر مفکرین سے منفرد اور ممتاز کرتی ہے وہ ان کی معاشی اساس ہے جو فرد کو طبقاتی پیکار کی بجائے اس مساوات اور سالمیت کا درس دیتی ہے جس سے سرمایہ دارانہ سوچ کے حامی جس میں سرمایہ معدودے چند ہاتھوں میں مرتکز ہو کر رہ جاتا ہے اور نہ ہی وہ جائز اثاثوں کو ریاست کی ملکیت قرار دیتے ہیں بلکہ وہ اسلام کے اس آفاقی اصول کے داعی ہیں کہ ضرورت سے زیادہ مال حقداروں میں تقسیم کر دو۔ جب معاشرے کا ہر فرد اپنی فاضل آمدنی حاجت مندوں میں تقسیم کر دے گا تو لامحالہ معاشرے میں طبقاتی تقسیم کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس سے قوم میں محنت کی عادت رفتہ رفتہ کم نہیں ہو جائے گی اور معاشرے میں بھکاری اور ہاتھ پھیلانے والے بتدریج زیادہ نہ ہو جائیں گے۔ ناقدین یہاں یہ بول جاتے ہیں کہ جب کوئی معاشرہ امر بالمعروف اور نہی المنکر پر عمل پیرا ہوتا ہے تو کردار و گفتار میں حیرت انگیز تبدیلیاں واقع ہو جاتی ہیں۔ تاریخ اسلام میں ایسی متعدد مثالیں موجود ہیں جب مسلمانوں نے اس روش کو اپنایا تو انھوں نے حتی الوسع دست سوال دراز کرنے سے گریز کیا۔ پھر عرب کی گلیوں میں ضرورت مند نہیں ملتا تھا۔ اس امر میں کوئی شائبہ نہیں کہ وہ ہر مسئلے کا تیر بہ ہدف علاج قرآن و سنت میں سمجھتے تھے اور ایسے نظام کے داعی تھے جس میں روٹی، کپڑا، اور مکان کی ذمے داری اگر ریاست پر ہے تو پھر بھی ریاست فرد کے بنیادی حقوق سلب نہیں کرتی اور ایسی جمہوریت جس میں سادہ لوح لوگوں کو بے وقوف بنا کر ان پر جمہوریت کی آڑ میں ملوکیت سایہ فگن نہیں ہوتی۔ وہ صنوبر کو باغ میں آزاد بھی اور پا گل بھی دیکھنا چاہتے ہیں وہ ایک ایسا نظام زندگی جو فرد کو فلاح و سلامتی عطا کرے، اسلامی نظامِ حیات میں موجود پاتے ہیں۔ اسی بات کو مزید واضح کرتے ہوئے جسٹس (ر) ایس۔ اے رحمن لکھتے ہیں:

> اقبال زندگی کو کلیتاً اخلاقی زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کا تصور حیات ارفع ترین مفہوم میں روحانی اور عینیتی ہے جس جدلیت کا تصور اقبال کے ہاں ملتا ہے وہ نفرت و پیکار کے بجائے محبت یا عشق کی جدلیت ہے۔ ایک طرف تو یہ عملِ جدلیت انسان کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ تسخیر کائنات کی غرض سے جہانِ مادہ کو جذب کرے اور دوسری طرف یہ اسے اس اعلیٰ سطح پر پہنچنے کے لیے ترقی کا زینہ مہیا کرتی ہے جہاں روحانی دائرے میں انسان تازہ بہ تازہ آرزوؤں اور مقاصد کی تخلیق سے اخلاق اللہ کو اپنے سر لیتا ہے۔ اس نقطۂ نظر اور اشتراکیوں کے مادی موقف کے درمیان مشترک اجزاء النادر کالمعدوم ہیں۔ اقبال کے لیے قرآن کا دیا ہوا نظام اسلامی ایک جامع، کامل اور حرکی نظام ہے جو ہر زمان اور ہر مکان میں نوع انسان کے کام آ سکتا ہے۔ صرف ایک بات میں فکر اقبال اور اشتراکی فلسفہ ایک دوسرے کے ہم آہنگ ہیں کہ دونوں بالا از مداخلت سرمایہ داری کو قطعی طور پر رد کرتے ہیں۔ لیکن اقبال اسلام کے اس سنہری عادلانہ نظام کا نام لیوا ہے جو سرمایہ داری اور اشتراک کے مابین حتمی توازن کی نشان دہی کرتا ہے۔(۷)

اقبال کی فکر اور ان کے فلسفے کی بحث کو سمیٹتے ہوئے ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کے نظریۂ فن اور ان کی شاعری پر بھی مختصراً عرض کرتا چلوں۔ جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اقبال ان معدودے چند مفکرین میں شمار ہوتے ہیں جن کی فکر کی گہرائی اور گیرائی کو ان کی زندگی میں پذیرائی مل گئی تھی اور نہ صرف اندرونِ ملک بلکہ بیرونِ ملک بھی ان کے نظریہ کو سراہا جانے لگا تھا۔ اگرچہ اس وقت بھی اختلافِ رائے رکھنے والوں کی کمی نہیں تھی لیکن اس اختلاف نے فکر اقبال کے نئے نئے گوشوں کو آشکار کرنے میں مدد کی تھی۔ اقبال کی شاعری میں ہمیں فطرت نگاری کے ساتھ ساتھ مقصدیت بدرجہ اتم نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں نہ تو گل و رخسار کے قصے بیان کیے ہیں اور نہ ہی ہجر و وصال کی داستانیں رقم کی ہیں۔ ان کے نزدیک ایسی شاعری محض وقت کا ضیاع ہے بلکہ وہ تو

مشاعروں میں جانے سے بھی حتی الوسع گریز کرتے تھے۔ وہ اگرچہ عقل و عشق میں عشق کو بلند مقام دیتے ہیں لیکن ان کا عشق مادی اور مجازی نہیں ہے بلکہ وجدان اور بصیرت کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے جس کے اظہار کے لیے شمع، جگنو، پروانے اور شاہین کی علامتیں استعمال کرتے ہیں۔ پروفیسر آل احمد سرور اقبال کے فنِ شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اقبال کے فلسفۂ حیات کے علاوہ ان کے نظریۂ فن کی بھی ہمارے نزدیک بڑی اہمیت ہے۔ اقبال نے صاف اور واضح الفاظ میں آرٹ کی مقصدیت اور افادیت کا ذکر کیا ہے وہ آب و رنگ کی شاعری اور حدیث دلبری کے ڈھونڈنے والوں کو شکوۂ خسروی کا پیغام دیتے ہیں۔ وہ مشرق کے نیستاؤں میں نفس گی تلاش کرتے ہیں۔ وہ ہند کے ہنرمندوں سے موت کی نقش گری کے بجائے زندگی کی عکاسی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ وہ محض حسن کے قائل نہیں وہ حیات بخش حسن کے پجاری ہیں۔ وہ مٹی کے سبو اور شیشے کی صراحی کے پھیر میں نہیں پڑے۔ مے میں شمشیر کی تیزی چاہتے ہیں۔ وہ اس شعروادب سے بیزار ہیں جو روح کو خوابیدہ اور بدن کو بیدار کرے۔ وہ اس شاعری کے قائل ہیں جو ذہن کو بیداری اور زندگی کو عمل سکھائے حسن ان کے نزدیک افادیت ہے۔ ان کے نزدیک معجزہ فن کی نمود خونِ جگر سے ہے۔(۸)

حواشی:

(۱) عبدالرحمن ترجمہ افتخار احمد، مضمون بعنوان "اقبال کا فلسفۂ خودی"، "فلسفۂ اقبال" مرتبہ سید وقار عظیم، بزمِ اقبال، لاہور ۱۹۷۰ء ص ۳۱-۱۵

(۲) عبدالرحمن طارق۔ "جہانِ اقبال" ملک دین محمد اینڈ سنز لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۲۲۹

(۳) میاں محمد افضل، "اقبال اور عالمی سیاست"، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۷۸ء، ص ۳۱-۳۰

(۴) سحر انصاری، مضمون بعوان "اقبال کا تصور مملکت ــــ فکرِ اقبال کے منور گوشے" مرتبہ سلیم اختر، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، س-ن، ص ۶۰-۲۵۸

(۵) رعنا اقبال، مضمون بعنوان "علامہ اقبال اور جمہوریت" ماہنامہ قومی زبان، کراچی نومبر ۱۹۹۱ء، ص ۳۷

(۶) سیدہ عظمیٰ گیلانی، "اقبال، ان کی شاعری اور عہد جدید"، ماہنامہ قومی زبان، کراچی نومبر ۱۹۹۸ء ص ۶۳-۶۲

(۷) جسٹس (ر) ایس-اے-رحمن "اقبال اور سوشلزم"، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور، ۱۹۷۸ء، ص ۷۵

(۸) پروفیسر آل احمد سرور، "اقبال اور ان کا فلسفہ" مکتبہ عالیہ، لاہور ۱۹۷۷ء، ص ۲۹-۱۲۸

اکیسویں صدی اور پیغام اقبال

ڈاکٹر مس عصمت ناز

نشاں یہ بھی زمانہ میں زندہ قوموں کا
کہ صبح شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں

فنون ادب میں شاعری کی ہمہ گیر تاثیر کو ہر عہد میں تسلیم کیا گیا ہے۔ شاعروں نے قوموں کی انفرادی اور مجموعی حیات پر حیرت انگیز اثرات مرتب کیے ہیں۔ کیوں کہ شاعری انسان کے فکر، جذبے اور تخیل کو یکساں طور پر متاثر کرتی ہے۔ اس ضمن میں فردوسی، سوری، رومی اور حافظ کے ساتھ دانتے، کیٹس وغیرہ کا نام بھی لیا جاسکتا ہے اور زمانہ جاہلیت عرب میں تو شاعری کا عنصر بہت ہی زیادہ ہے۔ یعنی شاعری عکس حیات و نقدِ حیات ہی نہیں تخلیق حیات بھی ہے اس لیے تاریخ انسانی کے بعض عظیم تحولات کے پس منظر میں شاعر کی ذات دکھائی دیتی ہے۔ دنیا میں بہت کم ایسے شعرا گزرے ہیں جنھیں ہم ماضی، حاضر اور مستقبل کا شاعر کہہ سکیں۔ لیکن علامہ محمد اقبال کو صحیح معنوں میں عہد آفرین شاعر کہا جاسکتا ہے۔

کیوں کہ شعر اقبال نے بیسویں صدی میں برصغیر پاک و ہند پر جو گہرے اثرات مرتب کیے اور عصر حاضر کے مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ کی تشکیل میں جو اہم اور بنیادی کردار ادا کیا ہے اس کی مثالیں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں، اقبال کا فکر و فن تاریخ سیاست اور ادب پر یکساں اثرانداز ہوتا ہے۔ آپ نے شاعری میں تاریخی شعور کو داخل کر کے زندگی اور شاعری دونوں کے آفاق کو حیرت انگیز طور پر وسیع کر کے اسے رفعت و شکوہ عطا کیا۔ یعنی یہ کہا جاسکتا ہے کہ شعور و احساس فہم و ادراک اور تلاش و جستجو تخلیق و تحقیق کے لیے لازمی اور ضروری ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ شاعر کی ذات بھی ارتقائے عمل میں ایک اکائی کی صورت نظر آتی ہے۔ کیوں کہ ماضی، حال اور مستقبل میں، عالم روزگار میں حادثات و انقلابات ترقی اور آگے بڑھنا ایسا عمل ہے جس کو شاعر اپنے وجدان کی مدد سے دیکھتا ہے اور اس کی ماہیت اور اس کے اسرار و رموز دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اس سعی و کوشش میں وہ کبھی کبھی ایسے حقائق و معارف کا استقرار بھی کر لیتا ہے جسے کبھی الہام کا نام دیا جاتا ہے اور کبھی جذب و تصوف کی کیفیت کا نام دیا جاتا ہے اور یہ خطابت کبھی شاعر کے ساتھ خلیفاؤں اور مورخوں کے حصے میں بھی آتے رہے۔

مگر حُسن اتفاق سے اور خدا کے عطیہ خاص سے اقبال شاعر بھی ہیں، صوفی بھی اور فلسفی بھی ہیں۔ ان کی تینوں حیثیتوں میں جو پہچان ہے وہ بڑی منفرد اور جاندار ہے حالاں کہ بطور شاعر وہ خود کہتے ہیں کہ:

مری نوائے پریشان کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ

یعنی آپ اپنے سامنے مقصد حال اور منتہائے مستقبل رکھتے تھے لیکن ماضی کا استعارہ ساتھ رہتا تھا کیوں کہ شاعری کے بارے میں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ خیال، جذبات، اور الفاظ کی مینا کاری ہے یا پھر حسن و عشق اور گل و بلبل اور گریۂ خزاں اور خندۂ بہار ہے۔ بہر حال یہ الگ بحث اور موضوع ہے۔ یہاں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اقبال نے اپنی شاعری یا اپنے جذبے اور فکر کی تقویم میں عصرِ رواں کے علاوہ زمانے کے اس مسلسل عمل سے کہاں تک کام لیا ہے اور امروز کے پیمانے میں دوش و فردا کو کہاں تک ناپا ہے وہ محوِ غمِ دوش ہی رہے ہیں یا فکرِ فردا بھی انھیں لاحق ہوئی ہے اور انھوں نے عصرِ رواں کے استقبال کی بھی تفسیر و تعبیر کی ہے یا نہیں؟

کیوں کہ اقبال کی شاعری میں ماضی سے لگاؤ کی بڑی والہانہ کیفیت ملتی ہے اس سے بعض اوقات یوں لگتا ہے کہ وہ ماضی پرست ہیں اور حاضر و موجود سے بیزار ہیں اور دورِ حاضر کی تہذیبی اوج کے شدید مخالف اور عصائے حکیمی کے ساتھ اس کے خلاف اعلانِ جنگ پر بھی اُتر آتے ہیں۔ لیکن وہ ماضی کے نشانات کی پرستش نہیں کرتے بلکہ ان کی روشنی میں وہ مستقبل کے امکانات کی تفسیر کرنا چاہتے ہیں۔

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

کا مطلب ہی یہ ہے کہ دوش کے آئینے میں امروز و فردا کا جائزہ لیا جائے اور زندگی کو خوب سے خوب تر بنانے کی جستجو کی جائے فرماتے ہیں:

یادِ عہدِ رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے
میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے
سامنے رکھتا ہوں اس دورِ نشاط افزا کو میں
دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو میں

اقبال کے نظریہ حیات میں مستقبل کی اہمیت بہت زیادہ ہے کیوں کہ کوئی بھی صائب سوچ رکھنے والا شخص مستقبل اور کل کی حقیقت سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔ اقبال نے اپنے اس نقطۂ نظر کو اپنے ایک انگریزی خطبے میں بڑی اچھی طرح واضح کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

قوم اپنے موجودہ افراد کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ اس سے بہت کچھ بڑھ کر ہے اس کی ماہیت پر اگر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ غیر محدود اور لامتناہی ہے اس لیے، اس کے اجزائے ترکیبی میں وہ کثیر التعداد آنے والی نسلیں شامل ہیں جو عمرانی نظر سے ابھی بہت دور ہیں۔ علمِ حیات کے اکتشافات جدیدہ نے یہ حقیقت واضح کردی ہے کہ جو لوگ ابھی پیدا نہیں ہوئے ہیں زیادہ بدیہی الوجود ہیں۔ ان کی وجہ سے سیاسی اور تمدنی تبدیلیوں کو دیکھا جاتا ہے۔ اسی لیے میں اپنی قوم کی موجودہ حرکت کو اس پہلو سے دیکھنا چاہتا ہوں۔(۱)

اقبال نے جس دور میں جنم لیا وہ ایک عالمگیر سیاسی اور انقلابی تبدیلیوں کا دور تھا ایک صدی ختم ہو رہی تھی۔ بیسویں صدی کا آغاز تھا عالم انسانی پر جنگ کے بادل چھا رہے تھے۔ اور پھر جنگ کے بعد تو تخریب کاری کے ہولناک مناظر تھے اور ساتھ ہی عصرِ نو کی تعمیر کے سامان ہو رہے تھے۔ مختلف تحریکیں شروع ہو چکی تھیں مگر ہولناکیوں کے ختم ہونے کا کوئی چارہ نظر نہیں آرہا تھا بلکہ دوسری عالمگیر جنگ کے آثار زیادہ واضح ہو رہے تھے کہ ایسے میں آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

یعنی جو واقعات آپ کی نظر سے گزرے آپ ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور ان تمام واقعات کے ہیرو پاولن اس دور کے قوی ہیکل دیوِ استبداد تھے جنھوں نے جمہوری لبادے اوڑھے ہوتے تھے اور اپنے مکروفریب سے لوگوں پر عرصہ حیات تنگ کر رہے تھے۔ دوسری طرف یہ کہ زوال و انحطاط کا زمانہ تھا۔

اگرچہ مشرق و مغرب کے تصادم کی ابتدا صلیبی جنگوں سے ہوئی لیکن آہستہ آہستہ مشرق میدان حرب و ضرب میں مغرب سے پوری طرح شکست کھا بیٹھا اور اس طرح تصادم کا رُخ میدان جنگ سے ہٹ کر اب اندرون خانہ یعنی تہذیب و معاشرت کی طرف ہو گیا۔ نت نئی ایجادات ہونے لگیں ترقی پر لگا کر اُڑ رہی تھی اور مسلمانوں کے ذہنی اعتبار سے شکست کھانے کے بعد اب ان میں قوت مدافعت بھی کم ہو رہی تھی۔ اور اس طرح بعض لوگوں نے فوری اغراض و مقاصد کی خاطر اور کچھ حاکموں نے اسیران قفس کو سدھانے کے لیے اپنے نظام وضع کرنے شروع کر دیے اور ایسے میں ہی اکبر الٰہ آبادی نے آواز اُٹھائی مگر نقارخانے میں اُن کی آواز بہت کم لوگوں نے سنی مگر علامہ اقبال نے ان کی آواز کو دُرست قرار دیا تھا فرماتے ہیں:

شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

اس طرح ایک نئی نسل وجود میں آگئی اور مغرب کا وہ مقصد جو وہ صدیوں کی جنگ سے حاصل نہ کر سکتے تھے چند عشروں میں پورا ہو گیا مگر اقبال کا ذہن محض عصر حاضر میں یا اس کی خرابیوں میں اُلجھ کر نہیں رہ گیا وہ عصر رواں میں مستقبل کے امکانات پر بھی نظر ڈال لیتا ہے۔ جیسا کہ اکبر نے کہا تھا کہ:

اور بھی دور فلک ہیں ابھی آنے والے
ناز اتنا نہ کریں ہم کو مٹانے والے

اقبال نے آنے والے کل کو اپنی دیدہ بین نگاہوں سے جان لیا تھا اسی لیے عصر نو کا استقبال اقبال کے وجدانِ شعری میں یقین کی صورت اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔ کیوں کہ اقبال کا عہد ایک لحاظ سے بین الاقوامیت کا عہد ہے۔ آپ نے عالمی تغیرات پر بھی نگاہ رکھی اور اس طرح آپ ہند اور ہمالہ سے نکل کر ایک وسیع دور میں داخل ہوتے ہیں۔

آپ نے مغرب کی جدیدیت کو دیکھا جس کے نتیجے میں ایسی تہذیب وجود میں آئی جو بظاہر خوشنما مگر تاریک تر تھی اور شاخ نازک پر اس کا آشیانہ تھا۔ دوسری طرف جمہوریت کے لباس میں آمریت اور وطنیت کے محدود تصور اور تجارتی نو آبادیاتی، حسد و رقابت نے دُنیا کو ایک دوسرے کا حریف بنا دیا تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ عالم اسلام میں جو نئی کروٹ تھی یا اتحاد اسلام اور پان اسلامزم کی جو تحریک تھی اس کا اثر بھی آپ نے محسوس کیا ترکی مرد بیمار تھا اور عرب کے ریگزاروں میں افریقہ کے جنگلوں میں نت نئی تحریکیں جنم لے رہی تھیں، شیخ عبدالوہاب، السنوسی، مہدی سوڈانی، امیر الادریس وغیرہ ایسی ہی شخصیتیں تھیں۔ سید جمال الدین افغانی کی تحریک کے بعد اقبال ایک نئے رنگ و فکر سامنے آتے ہیں۔ اور یہ کہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

اُٹھ کہ ظلمت ہوتی پیدا افق خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں

یا پھر یوں گویا ہوتے ہیں:

سنا دیا گوش منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہو گا
نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شہر پھر ہوشیار ہو گا

امروز کے آئینے میں فردا کا تصور دکھانے کے ساتھ اقبال ایک لائحہ عمل بھی بنا لیتے ہیں اور کہتے ہیں:

میں ظلمت شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہو گی آہ میری، نفس میرا شعلہ بار ہو گا

اور پھر اس لائحہ عمل کی روشنی میں شعور و احساس کے بل بوتے پر اپنے آئندہ افکار و اشعار کی بنیاد رکھی۔ آپ اپنے عہد کے واقعات سے متاثر ضرور ہوتے مگر نظر زیادہ تر مستقبل کے امکانات پر اٹھتی۔ طرابلس کا اضطراب اور شکوہ کرنے کا انھیں حق تھا فکر جواب شکوہ نے ایک نیا یقین اور نئی زندگی دی اور آہستہ آہستہ خودی اور بے خودی کے اسرار و رموز کھلنے لگے کیوں کہ جنگ کا لاوا تباہی اور بربادی کے جو ہولناک مناظر چھوڑتا ہے اور جو آہیں اور تسلیاں سنائی دیتی ہیں، ان میں سے ہی نئی زندگی کی راہیں نکالی جاتی ہیں۔ لہذا اقبال نے بھی آمریت، اشتراکیت، سرمایہ داری وغیرہ کو بنظر غائر دیکھا اور ابلیس کے مشیروں کو بھی پیچ و تاب کھاتے دیکھا ان کی چشم جہاں بین نے ہمالہ کے چشم آب رواں کو ابلتے دیکھا۔ اور گراں خواب چینیوں کو سنبلھتے ہوئے دیکھا، ان حالات میں انھیں ملت اسلامیہ کی گراں خوابی اور بے حسی مضطرب اور بے چین کر جاتی ہے۔ مگر ساتھ ہی آپ آنے والے دور کی سحر بے حجاب کو دیکھتے ہیں اور فرماتے ہیں:

آب روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
عالم نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روح امم کی حیات کشمکش انقلاب
صورت شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

شاعر مشرق کی حقیقت بین نگاہ نے جو سر بے حجاب دیکھا پہلی جنگ عظیم کے بعد دوسری جنگ عظیم نے اس خیال کو حقیقت میں بدل دیا اقوام مغرب کو اپنا انجام نظر آنے لگا۔ اور آج دنیا اگر کسی عالمگیر تصادم سے محفوظ ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس کی ہولناکیوں پر کچھ کچھ جاننے لگے ہیں۔ ورنہ انھوں نے خلاؤں کو تسخیر کیا، فضاؤں میں اُڑنا سیکھا، ستاروں پر کمندیں ڈالیں، مگر دھرتی پر بہتر زندگی نہ دے سکے قلب انسانی کی تسخیر کو تو ایک طرف رہنے دیں۔ یعنی دور حاضر کا انسان ہلاکت و بربادی کے کنارے کھڑا ہے کہ:

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزر گاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلہ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاؤں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

اور اب یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آ گئی ہے کہ سائنس کی ایجاد و ترقی انسان کی فلاح و بہبود کے کام اس صورت میں آئے گی جب مادہ اور روحانیت کو ہم آہنگ کر کے انفس و آفاق میں ایک خوشگوار توازن قائم کیا جائے گا۔ سائنس کو اس وقت لادین سیاست نہیں بلکہ مذہب کی دوستی اور راہنمائی کی اشد ضرورت ہے۔ انسان اس طرح سے سیدھے راستے پر بھی چل سکتا ہے اور افلاک پر پرواز بھی کر سکتا ہے۔ زمان و مکان کی حدیں اب سمٹ گئی ہیں مشرق و مغرب اب عالمی سیاسیات کی اضافی اصطلاحات بن کر رہ گئے ہیں۔ اور کلام اللہ تو پہلے ہی "اللہ کے لیے ہیں مشرق و مغرب" کہہ چکا اور شاعرِ مشرق نے بھی اسی حوالے سے کہا تھا کہ:

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ:

اگر تخت طاؤس ایران کا فخر ہے اور کوہ نور برطانوی تاج کی شان و شوکت کا سبب ہے تو یقیناً اقبال دنیا کے ہر ملک کے دربار شاعری کی زیب و زینت ہے۔ (۲)

اس لیے انھیں ترجمان حقیقت اور حکیم الامت کہا جاتا ہے کہ آپ نے برملا طور پر قوم کو مخاطب کر کے دعوت عام دی تھی کہ:

کھول کر آنکھیں مرے آئینہ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اِک تصویر دیکھ

یا پھر یوں کہا جاسکتا ہے کہ:

جہاں تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

آپ نے مسلم امت کو جو پیغام دیا جو ولولہ دیا جو خواب دکھایا شاید اسی وجہ سے قائداعظم نے فرمایا تھا کہ:

اگر میرے پاس کوئی سلطنت ہوتی اور مجھے کہا جاتا کہ اقبال اور سلطنت میں سے کسی ایک کو چن لو تو میں یقیناً اقبال کو منتخب کرتا۔(۳)

لہذا یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ بیسویں صدی میں اقبال کے افکار نے جس قدر امت کے دلوں کو ڈھارس بندھائی اس طرح بہت کم افراد کر سکتے تھے۔ اور امت کا یہ دور دورِ اقبال مندی ہے اور ساتھ ہی اقبال شناسی کی طرف ہم بڑھ رہے ہی۔ اس لیے بیگم عطیہ فیضی نے اس طرف اشارہ دیتے ہوئے ایک خط جو کہ علامہ نے ان کے نام لکھا تھا میں بتایا ہے کہ علامہ فرماتے ہیں کہ:

وہ خیالات جو میری روح کی گہرائیوں میں طوفان بپا کیے ہوئے ہیں اگر عوام پر ظاہر ہو جائیں تو مجھے یقین ہے کہ میری موت کے بعد میری پرستش ہو گی۔(۴)

برصغیر میں اقبال کی پیدائش ایک معجزہ ہی کہی جا سکتی ہے کہ جس طرح سے آپ نے قوم کی مسیحائی کا فریضہ سرانجام دیا ان کے جسدِ افسردہ میں ایک نئی امنگ اس طرح سے پیدا کی کہ ان کا کارواں پھر منزل کی طرف گامزن ہونے کے لیے چل نکلا۔ ایسے نابغہ روزگار قوموں کی زندگی میں مدتوں بعد پیدا ہوتے ہیں لیکن ان کا ظہور ایک فکری انقلاب کا پیش خیمہ بن جاتا ہے اسی لیے یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ آپ اپنے دور کے ہی نہیں بلکہ آنے والے ہر دور کے بھی شاعر ہیں آپ کا پیغام محدود نہیں ہے بلکہ آفاقی ہے اس میں وسعت ہے۔

اور اسی وسعت کے باعث آپ نے روایات میں الجھی ہوئی قوم کو تقلیدی ذہنیت اور محورِ باطنیت کے گرد گھومنے والی خلوت پسند قدوسیت سے نکال کر صحیح اسلامی شعور بخشا اور شاید ماحول بھی ایک مردِ خود آگاہ کے انتظار میں تھا جو سر نہ تراشے مگر راہ و رسم قلندری کا رازداں ہو جو روحِ عصر کا بخوبی آشنا ہو۔ جو لوگوں میں خودی کی قندیل روشن کرے اور زندگی کی فعال قدروں کو اجاگر کر دے آپ مجمع البحرین تھے اور رمز شناس تھے۔ فلک ادب کی رفعت تھے۔ آپ کی نگاہ دور بین تھی آنے والا دور آپ کی نگاہوں کے سامنے تھا لیکن اس کے باوجود فرماتے ہیں کہ:

دل بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

اور یہ ہی بات آپ اپنی قوم کو سمجھانا چاہتے تھے کہ آنے والے دور کے تقاضوں کو سمجھا جائے اور قرآن کے قول کے مطابق ایمان دلوں میں اترنا چاہیے۔(۵) اور انھیں سوچنا اور سمجھنا چاہیے۔ کیوں کہ علم صحیح معنوں میں علم اسی وقت بنتا ہے جب یقین کے درجے کو پہنچتا ہے۔ اور اندرونی اور بیرونی حقیقت اور کیفیت ایک ہو جاتی ہے بلکہ یک جان ہو جاتی ہے۔ لیکن صورت حال یہ ہے کہ اقبال کا پیغام جو نوجوان نسل کے لیے تھا، جو ملت اقوام مغرب کے لیے تھا۔ جو امت مسلمہ کے لیے تھا، جو تہذیب نو اور اس کے خطرات پر تھا، جو سیاسی نظاموں اور عوام پر تھا، جو تعلیم اور نصاب پر تھا جو دین اور اس کے رموز پر تھا۔ سب کچھ رفتہ رفتہ ہم لوگ بھلا رہے ہیں۔

زندگی کے حقائق سے دور ہو رہے ہیں۔ اور داخل ہونے جا رہے ہیں اکیسویں صدی میں ــــ آج دنیا کے بیشتر حصوں میں اولادِ آدم معاشی اور روحانی کرب کا شکار ہے۔ نئی تہذیب ایک بار پھر نوجوان نسل پر حاوی ہو رہی ہے تشخص خطرے میں ہے مدارس صحیح سمت تعلیم نہیں دے پا رہے ہیں حالاں کہ اقبال نے فرمایا تھا کہ:

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کا بے ربط نظام

احترام آدمیت اور احترام انسانیت اٹھتی جارہی ہے۔ خودکشی کی وارداتیں قتل وراہزنی، زنا، اغوا کے واقعات محض معاشی تقاضوں اور طبقاتی کشمکشوں کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ مقصدِ حیات اور غلط تربیت اور بے جا آزادی اس کا سبب ہے اور زندگی کے فضول ہونے کے احساس نے آدمی کو حیوانیت کی طرف دھکیل دیا ہے اور آدم آج بحیثیت خود اپنی نظروں میں بے قدر ہو کر رہ گیا ہے اور یہ بات باعث حیرت ہے کہ اقبال نے بہت پہلے کہا تھا کہ:

رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف

یا پھر ان خطرات کو، ان تہذیبی و تمدنی مصائب کو آپ نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا اور ان کو پرکھ کر کہا تھا کہ:

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہگذر سیل بے پناہ میں ہے

آج اس صدی کے آخر میں مذہب و تہذیب سے دوری بہت عام نظر آرہی ہے مشرق کے لوگ مغرب کا رخ کر رہے ہیں اور مغرب کے لوگ سکون کی خاطر مشرق آرہے ہیں اور آگاہی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ایک نفسا نفسی اور بے چینی کی کیفیت عام معلوم و محسوس ہوتی ہے حالاں کہ اقبال نے یہ کہا تھا کہ:

ہے ذوق تجلی بھی اِسی خاک میں پنہاں
غافل! تو نرا صاحب ادراک نہیں ہے

اور آپ نے اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ یورپی اقوام و علوم کی بدبختی یہ ہے کہ ان کی قدرت عناصر پر تو بڑھتی جارہی ہے مگر قلب خالی ہوتا جارہا ہے اس لیے ان کی تعلیم کا رُخ بھی درست نہیں ہے اور انھیں معاشرے میں سکون میسر نہیں ہے۔ اور علم کا مقدمہ برائے علم ہی نہیں بلکہ ان کا مقصود تعمیر کردار بھی ہے جیسا کہ صاحب کشف الظنون نے کہا ہے کہ:

علوم سے کمال ہی مراد نہیں اس سے مراد حقائق سے آگاہ ہونا اور اخلاق سدھارنا ہے۔(۶)

لیکن کیا کریں کہ آج اساتذہ بھی ناپید ہیں۔ چمک دمک کے رسیا ہیں بنیادی فرائض سے غافل ہیں۔ عمارتیں بڑی بڑی ہیں لائبریریاں خوبصورت ہیں۔ کمپیوٹر عام ہو رہا ہے۔ مگر تعلیم و تربیت نظر بہت کم آتی ہے۔ حالاں کہ تربیت صرف لفظوں سے نہیں ہوتی بلکہ فیضان نظر کا بھی کمال ہوتا ہے۔ استاد کا کردار بھی ہوتا ہے کہ:

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آداب فرزندی

یعنی فیضان نظر کے ساتھ مکتب اور استاد بھی اہمیت کے حامل ہیں اور خرد کے ساتھ ساتھ نظر بھی ہونا ضروری ہے۔ نظر وہ نگاہ جو دلوں میں اتر جائے کہ:

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

لہذا اگر علامہ اقبال اہل مدرسہ سے بدظن تھے تو اس کے لیے وجہ جواز موجود تھی۔ پرانے زمانے کا استاد کردار سازی بھی کرتا تھا۔ تعمیر روح کا فریضہ بھی سرانجام دیتا تھا، مگر اب استاد الگ بتاتا ہے، نشریات الگ بتاتی ہیں۔ رسائل کی ترغیبات علاحدہ ہیں لہذا صرف استاد ہی نہیں بلکہ دیگر عناصر نے بھی استاد کی وقعت کو کم کر دیا ہے تو کیا اس امر کی ضرورت آج پہلے سے کہیں زیادہ نہیں ہے کہ ہم اقبال کے پیغام کو عام کریں۔ استاد بچوں کو صحیح شاہین بنا کر قبیلے کی آنکھ کا تارا بنا دیں۔ نئی نسل کو سنواریں۔ والدین کو ان کی ذمے داریوں سے آگاہ کریں۔ معاشرے کی خرابیوں پر نظر رکھیں۔ خیر و شر کے مسائل کو سمجھیں، روحانیت کو بلند کریں۔ کہ آج اس کی بہت ضرورت ہے۔ علامہ کی فریاد جو انھوں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کی تھی کہ:

> مسلمان اسلام کی راہ سے ہٹ گئے ہیں توحید کا دامن چھوڑ دیا ہے مکتبی علم نے انھیں دین سے دور کر دیا ہے یارسول اللہ آپ ہی میرا علم ہیں۔ آپ ہی میرا سازو برگ ہیں۔ میرے قلب و دماغ کو پھر قدیم نور ایمان عطا ہوتا کہ میں دوسروں کو بھی راہ دکھا سکوں اور مادہ پرستوں کی پیدا کردہ تاریکیوں کو بھی دور کر سکوں۔(۷)

علامہ اقبال نئے علوم و افکار کے اس لیے مخالف نہیں تھے کہ وہ نئے ہیں بلکہ ان علوم کی مادی بنیاد اور اساس اور مادی تعلیم و تاثیر کے مخالف تھے جس سے ضمیر آدم مسخ ہو رہا تھا۔ حالاں کہ آپ تو نئے جہانوں کی نوید دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آگے بڑھ اس طرح سے کہ:

تورہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشین ہو تو محمل نہ کر قبول
ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

علامہ اقبال نے محسوس کیا تھا کہ اقوام عالم جس طرف جا رہی ہیں وہ تباہی کا راستہ ہے اور انسانیت رفتہ رفتہ تباہی کی جانب گامزن ہے۔ آپ نے بے راہ رو جمہوریت جس میں بندوں کو تولتے نہیں ہیں گنتے ہیں۔ سرمایہ داری نظام، غریب، بڑے بڑے زمینداری نظام، کسان کی اہمیت، مزدور کی طاقت، ابلیس کی شرارت، علم کی قوت، اسلام کی ہیبت، خواتین اور بچوں کی اہمیت، ان کے فرائض، نظام سیاست و حکومت قوموں کے زوال کی وجوہات، بلندی کی خواہش، نظام تعلیم، اساتذہ، نوجوان نسل، پیرانہ سالوں، مغرب اور مشرق، کتابوں، فلسفے، تاریخ مذہب، سائنس، فلکیات اور ہیئت، معاشیات اور ادب غرضیکہ ہر موضوع پر ایسا وسیع مطالعہ پیش کر کے ایک ایسی ہمہ گیری حاصل کی ہے کہ ان کا کہا ہوا سچ نظر آتا ہے۔ آج ان کی وفات کے ۶۲ سال بعد بھی مسائل ویسے ہی نظر آتے ہیں۔ تو یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اقبال کے پیغام کو سمجھنا چاہیے کہ یہ پچھلی صدی کا پیغام نہیں ہے بلکہ بعض حالات سے مطابقت رکھتا ہے اور آنے والی صدی میں راہنمائی کے فریضہ کے سرانجام کی پوری اہلیت رکھتا ہے کیوں کہ اقوام متحدہ بڑی طاقتوں کا اکھاڑہ بن گیا ہے، سیہون گروپ اپنی من مانی کر رہا ہے، چھوٹی قوموں کو قرضوں کے چنگل میں جکڑا جا رہا ہے۔ ان کے باہمی تعصبات فروغ پا رہے ہیں۔

کالے اور گورے کی تمیز آج بھی باقی ہے۔ سرمایہ داری پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ مغربی تہذیب کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے، علما کے تنازعات ابھی بھی زندہ ہیں، عالم اسلام کا اتحاد ابھی قائم نہیں ہو سکا ہے۔ مسلمان محکوم ہیں مجبور ہیں ظلم و ستم برداشت کر رہے ہیں۔ آمریت آج بھی کام دکھا رہی ہے۔ انسانیت آج بھی ذلیل و رسوا ہو رہی ہے نئی نسل بے لگام ہونے چلی ہے۔ ماؤں کو فرائض سے آگاہی نہیں تو باپوں کو اس کی پروا نہیں۔ فلسطین و کشمیر ابھی آزاد نہیں ہوئے۔ وسطِ ایشیا اور افریقہ کے اندر نسلی فسادات ہو رہے ہیں۔ آپس میں یگانگت نہیں ہے رواداری عنقا ہے۔ دولت اکٹھی کرنے اور اس کی بے جا نمود و نمائش عام ہے۔ مل مالکان ابھی بھی مزدوروں پر تشدد کرتے ہیں ابھی بھی دہقان دو وقت کی روٹی کے لیے محتاج ہے۔ قرآن طاقوں میں سجا ہوا ہے۔ سحر خیزی مشکل نظر آتی ہے کہ شب بیداری بہت ہے مگر کس لیے؟ تفریحات کے لیے، ابھی بھی شمشیر و سناں آخر ہیں اور طاؤس و رباب اول ہیں، دینی بات کرنے والا خود اندر سے بے یقینی کا شکار ہے۔ لسانی و علاقائی تعصبات عام ہیں۔ نمود و نمائش عام ہے ___ تو کیا ایسے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس صدی میں ہم نے اپنے مقاصد حاصل کر لیے ہیں نہیں۔ ہر گز نہیں۔ ہمیں آج بھی کلام اقبال کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کی تشریحات کی ضرورت ہے۔ اکیسویں صدی میں اس کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہے کہ ہم اس صدی کا تجزیہ کریں گے تو خود کو وہیں کا وہیں کھڑا ہوا پائیں گے علامہ کے تصور ملت کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔

آج جب زندگی کے بہت سے زاویے نئی صورت میں جلوہ گر ہو رہے ہیں تو اس بات کی بہت ضرورت ہے کہ اقبال کے افکار کو نئی صدی میں اقبال کی فکر اسلامی و اتحاد اسلامی اور ان کی روحانی اور اخلاقی فلسفہ زندگی کی روشنی میں پیش کیا جائے، کیوں کہ آپ کا پیغام منفرد تھا۔ اس نے مغرب و مشرق کو چونکا دیا تھا اور آج بھی پوری دنیا میں اقبال پر جو تحقیقی کام ہو رہا ہے جس طرح سے آپ کے افکار کی تشریحات ہو رہی ہیں اور آپ کا اثر و نفوذ عام ہو رہا ہے۔ اس سے شائبہ ہوتا ہے کہ آپ کا پیغام زمان و مکان کی بندشوں سے آزاد ہے۔

آج تیسری دنیا، اسلامی بلاک، جنریشن گیپ، قدیم و جدید کے ٹکراؤ اور سائنس، ٹیکنالوجی، فنون لطیفہ، خود کلامی، خودی، بے خودی، کا جو نام لیا جاتا ہے، اقبال نے بہت پہلے ان خطوط پر سوچا تھا، اور ان کا حل بھی پیش کیا تھا۔

لہذا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اقبال کا پیغام عالمگیر پیغام ہے۔ اس کا نصب العین وسیع و عریض ہے، کیوں کہ جس پیغام و دعوت کی اساس قرآن ہو وہ اقوام و ملت کی قیود سے نکل جاتا ہے۔ "رب العالمین کی طرح عالمینی ہو جاتا ہے۔"(۸) اقبال کی زندگی کا نصب العین زندگی کی گہرائیوں میں انقلاب پیدا کرنا ہے۔ پہلے وہ انسانوں کے ضمیر میں اپنا "عالم نو، تشکیل کرنا چاہتے ہیں اور پھر انھیں یقین ہے کہ ان کی سوز دروں میں ڈوبی ہوئی ایک نئے انقلاب کا پیش خیمہ ہوگی۔

چناں چہ آج ہم وثوق کے ساتھ نئی صدی کی دہلیز پر اقبال کے پیغام کو عام کرتے ہوئے بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ:

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

حواشی:

(۱) ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر (ترجمہ ظفر علی خاں) ص ۵۶

(۲) نواب ذوالفقار۔ A Voice from the East (صدائے مشرق) ص ۱۸
(۳) اقبال اور قائداعظم، ملتان یونی ورسٹی، ص ۶۳
(۴) خطوط اقبال بنام بیگم عطیہ فیضی رسالہ اردو اقبال نمبر، ص ۸۲۲
(۵) القران الکریم، سورۃ ۶۹، آیت ۱۴
(۶) القربین والیقلم فی الاسلام، بیروت ص ۱۴۴
(۷) ماخوذ از "پس چہ باید کرد"
(۸) اقبال کا پیغام اسلامیت، پروفیسر محمد سرور ص ۱۳۲

جدید اردو افسانے کے رجحانات

از

ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش

قیمت:۔/۳۲۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان۔ڈی۔۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال کراچی ۷۵۳۰۰

افکارِ عالیہ

ترجمہ اور خلاصہ: ڈاکٹر خان رشید، قاضی قیصر الاسلام

مقدمہ: جمیل الدین عالی

قیمت:۔/۱۳۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان۔ڈی۔۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال کراچی ۷۵۳۰۰

علامہ اقبال اور مسلم نشاۃِ ثانیہ

نسیم نیشو فوز

لفظ نشاۃِ ثانیہ اپنی بنیاد میں علم و فن کی ایک ایسی تحریک ہے جس کا مطلب ہے ''دوبارہ جنم لینا'' یہ تحریک اٹالین تحریک ہے جس میں یونانی زبان و ادب کو کلاسیکل ماڈل بنایا گیا اور اس کے سہارے اطالوی زبان کے توسط سے علوم جدیدہ کا احیا کیا گیا۔

لیونارڈو ڈاونچی، مائیکل انجلو اور ریفائیل نشاۃِ ثانیہ کے آرٹسٹ تھے جبکہ ڈانٹے ایلی گھری اور پٹرارک عالمی ادب کے پیش رو تھے۔ چودھویں اور پندرھویں صدی کا زمانہ نشاۃِ ثانیہ کا زرین عہد کہلاتا ہے۔

ڈانٹے ایلی گھیری کی فلسفیانہ و شاعرانہ تمثیل ''طربیۂ خداوندی''(۱) کا مقابلہ و موازنہ اکثر اوقات علامہ اقبال کی تمثیل نما نظم ''جاوید نامہ'' سے کیا جاتا ہے۔ ہم ''جاوید نامہ'' کو مسلم نشاۃِ ثانیہ کا لازوال ادب پارہ قرار دے سکتے ہیں۔

بے شک ڈانٹے کی ڈیوائن کامیڈی کا کینوس لامحدود ہے (جنت، جہنم اور عالم برزخ) جاوید نامہ کا کینوس بھی اسی قدر وسیع ہے (افلاک کی سیر اور مسلم بطول جدیدہ سے ملاقات) بنیادی فرق یہ ہے کہ ڈیوائن کامیڈی ڈانٹے کی محبوب بیترلیس ڈی پونٹی ناری کی محبت اور اس کی شان و عظمت کو بڑھانا چڑھانا ہے جبکہ ''جاوید نامہ'' مرد حق (زندہ رُود) کی حق حضوری ہے یعنی عشق حقیقی کی تلاش ہے:

زاں تجلی ہا کہ در جانم شکست
چوں کلیم اللہ فتادم جلوہ مست

وہاں ہاتف الٰہی کی ندائے جمال ہے اور ڈیوائن کامیڈی میں شاہان شاہِ الہ کے قنوطی شیڈز (Shades) ہیں۔

مسلم نشاۃِ ثانیہ کا خام نقشہ شام، عراق، ایران، ترکستان اور ہسپانیہ کی وہ سرزمین ہے جہاں مسلم فلسفہ سائنس نے اپنی

مرکزیت پائی اس نشاۃِ ثانیہ کے علم وادب کی زبان عربی رہی اور اس نشاۃِ ثانیہ کا زمانہ ۸۰۰ھ تا ۱۲۵۰ھ بعد از مسیح ہے۔ اس عہد کے بڑے نام الجاہز، الکندی، فارابی، حکیم ابن سینا، حضرت امام غزالی، ابنِ رُشد، الخوارزمی، الغرغانی اور طوسی تھے۔ عرب تہذیب آرامی، ایرانی اور یونانی عناصر سے عبارت تھی۔ عرب تہذیب نے یونانی علم و حکمت کا دائرہ کار بڑھایا۔ تیرہویں صدی میں عرب تہذیب زوال پذیر ہونے لگی۔

برطانوی مصنف رچرڈ سائمنڈز اپنی کتاب "میکنگ آف پاکستان" کے دوسرے باب میں مسلم نشاۃِ ثانیہ سے مراد غیر منقسم برصغیر کا نشاۃِ ثانیہ لیتا ہے جس سے اس کی مراد تین شخصیات ہیں جن کی علمی وادبی خدمات بے پایاں ہیں۔

۱۔ سر سید احمد خان

۲۔ سید امیر علی (بیرسٹر و مورخ)

۳۔ اور علامہ اقبال

یعنی ایک معنی میں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد انڈین مسلمانوں کی مغربی خیالات سے ہم آہنگی و انفصال مندرجہ بالا تین شخصیات سے ہی ممکن ہو سکا۔

علامہ اقبال نے مغربی تہذیب سے بغاوت کی مغربی سرمایہ دارانہ نظام سے بغاوت کی اس سے نفرت کا اظہار کیا... ایسا نظام جو انسان کو انسان سے لڑاتا تھا۔ قوم کو قوم سے متصادم کرواتا تھا۔

علامہ اقبال نے انڈین مسلمانوں میں بیداری کا پرچار کیا..... ایسی بیداری نہیں جو ایک فرد کو مغربی سرمایہ داری کی شاہراہ تک لے جاتی ہے بلکہ ایک ایسی بیداری جو آفاقی بھائی چارے کی بالکل واضح اسلامی شاہراہ تک لے جاتی ہے۔ اس بیداری میں نہ صرف دمشق، بغداد اور ہسپانیہ کی عظیم الشان سلطنتوں کا مطالعہ آتا ہے بلکہ پہلے چہار خلفائے راشدین کے جمہوری معاشرے کا مطالعہ بھی آتا ہے۔

اٹھارہویں صدی کے بطل جلیل جمال الدین افغانی ایک جگہ لکھتے ہیں:

"ہر مسلمان بیمار ہے اور اس کا علاج فقط قرآن حکیم میں ہے!"

جمال الدین افغانی اور ان کے رفقا کار جس نئے سیاسی نظام کے آرزومند تھے وہ نظام تھا تمام اسلامی ریاستوں کو پین اسلام ازم (Pan Islam-ism) کے جھنڈے تلے یکجا کرنا۔ جمال الدین افغانی کا پین اسلام ازم کا خواب علامہ اقبال کا خواب بھی تھا۔ لہٰذا وہ غیر منقسم برصغیر میں مسلم نشاۃِ ثانیہ کے بجا طور پر بطل جلیل تھے۔

اطالوی نشاۃِ ثانیہ کے باعث یورپ علوم جدیدہ سے بہرہ مند ہوا، جدید سائنس کے اسرار و رموز سمجھنے لگا مگر یہ علوم و فنون یورپی اقوام نے غرناطہ اور قرطبہ کی جامعات سے سیکھا تھا۔ علامہ اقبال یہ ثابت کر کے دکھلا دیتے ہیں کہ مغرب کا علم و

فن یونان کے خام فلسفے سے عبارت تھا اور یونانی فلسفہ فقط عقل کی قیاس آرائیوں کا دوسرا نام ہے اس کا مرکزی عشق نہیں جو اپنی ہی بھٹی میں جل کر وحی والہام کا درجہ اختیار کر لیتا ہے۔

اطالوی نشاۃِ ثانیہ بت گری وبت پرستی کا دوسرا نام ہے۔ بصری فنون کے ذریعے عیسائیت وپاپائیت کا پرچار ہے۔ اسلامی نشاۃِ ثانیہ (جو ہر عہد میں زمان ومکان سے بالاتر ہے) وحی والہام کا پیراہن پہنے توحید پرستی کا اصل نام ہے۔ ع:

اھل حق را رمز توحید از براست

شعوری ولاشعوری زاوئیے سے علامہ اقبال کا پیغام دراصل پین اسلام ازم کا پیغام ہے (جس طرح عصر حاضر میں امریکہ..... پین امریکانا کی ترقی وترویج چاہتا ہے) جس طرح (غیر منقسم برصغیر میں برطانوی سامراجیت پین بریطانیہ تھی) لہٰذا مسلم نشاۃِ ثانیہ کے وسیع المعنی منشور کو بذریعہ کلامِ اقبال جاننا ازحد ضروری ہے۔

لغوی معنوں میں اطالوی نشاۃِ ثانیہ اور مسلم نشاۃِ ثانیہ کے خط امتیاز کو سمجھنا ضروری ہے۔

ول ڈوراں (Will Durant) لکھتا ہے:

''ارسطو کی وفات کے بعد ایک ہزار سال تک یورپ کے چہرے پر اندھیرا چھایا رہا۔ ساری دنیا فلسفے کے احیا کی منتظر تھی۔''

وِل ڈوراں کے یہ جملہ تحریر کرنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ ہمیں فلسفے وسائنس کی اساس کے مخرج کو ازسرنو جاننا ہو گا اور یونانی فلسفے کی گہرائی سے مرعوب ہوئے بغیر علامہ اقبال کے کلام کو اپنا عملی درس بنانا ہو گا..... اسلام کے مکمل ادراک کے لیے پین اسلام ازم کی وسعتوں کو اپنانے کے لیے۔

ایک جگہ علامہ اقبال لکھتے ہیں:

''مسلم ریاست کے خیال سے ہندوؤں اور انگریزوں کو خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ برصغیر میں اسلام کی زندگی بطور ثقافتی قوت کے اظہار کا بڑا دارومدار اس کی مرکزیت میں ہے۔

(ایسی مرکزیت کے لیے علامہ اقبال مخصوص علاقے خصوصاً نارتھ ویسٹ انڈیا کا ہونا ضروری سمجھتے تھے۔)

یعنی ارض پاکستان کو وہ اسلامی نشاۃِ ثانیہ کا گڑھ بنانا چاہتے تھے..... ایک ایسا مسلم یوٹوپیا (Utopia) جس کی تشکیل وتعمیر چہار خلفائے راشدین کی ''جمہوریہ'' کی طرز پر ہو۔ ایک ایسی ارضی جنت جہاں ہر ذی روح بے مثل تکملہ کی مثال آپ ہو جہاں مرد مومن کو بغیر علامت واستعارے کے آگے بڑھنے اور چھا جانے کی مکمل آزادی ہو جہاں اسلامی اقدار وروایات کی بار بار تلقین نہ کی جائے بلکہ مذکورہ اقدار میں از خود روحانی ڈسپلن پہلے سے موجود ہو۔

یہ روحانی ڈسپلن خودی کا ظاہر ہو، خداشناسی کا باطن ہو، عشق رسول ﷺ کا حاصل ہو مرد مومن کا کلام ہے، اس الوہی

روشنی کا منظر ہو جو کوہ طور کی تجلی سے عبارت ہے اور جو قرآن حکیم کے ارشاد کے مطابق ''دین حنیف'' کی تعبیر ہے۔

پاکستان میں اسلامی نشاۃِ ثانیہ کا اساسی وجود ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' (علامہ اقبال کے چھ خطبات ہیں) جن کا فہم و ادراک کرنے کے بعد ایک باقاعدہ قابل عمل سیاسی دستور بنایا جا سکتا ہے۔

یعنی قرآن حکیم اور احادیث نبوی جیسے اعلیٰ ترین دستور حیات کے بعد اور علامہ اقبال کے چھ خطبات کی تفہیم کے بعد ہماری مسلم ثقافت کی صادق بنیاد قائم کی جا سکتی ہے۔

علامہ اقبال کے چھ خطبات کو ہم اپنے وطن کا دستور العمل بنا کر ہم روشن خیال انسان کی طرح مسلم ثقافت کا کماحقہ مفہوم جان سکتے ہیں اور پین اسلام ازم کے روحانی ہدف کو بھی پا سکتے ہیں۔

ملحد فلاسفہ فریڈرک نطشے، کارل مارکس، سگمنڈ فرائڈ اور سارتر کسی بھی تہذیب و ثقافت کی مدد و معاونت کے لیے خداوند تعالیٰ میں مذہبی یقین پر اثبات کرتے ہیں اُن کے مقابل علامہ اقبال کا فلسفۂ ثقافت پورے کا پورا الوہی ایقان و اثبات ہے۔

مثلاً علامہ اقبال کا خطبہ ''اسپرٹ آف مسلم کلچر'' اپنی بنیاد و اساس میں توحید و رسالت کا پیغام دیتا ہوا اسلامی نشاۃِ ثانیہ کی روحانی آواز ہے۔ پراطالوی بت پرستانہ نشاۃِ ثانیہ نہیں بلکہ پوری انسانیت کا نشاۃِ ثانیہ ہے یا اس نشاۃِ ثانیہ کا اساسی سنگ میل۔ علامہ اقبال کا فلسفہ ثقافت حواس خمسہ کی صلیب پر ٹنگی ہوئی ''عقلیت'' نہیں بلکہ وجدان و روحانیت کی ''خدامستی'' ہے۔ ولایۂ ربی میں خودی کی ہنگامہ آرائی ہے:

موج بیتابی ز دریائے خودی

المختصر ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' کی مکمل تفہیم و تشریح کے بعد ہی ہم عصر حاضر کے مسلم نشاۃِ ثانیہ کی جانب بڑھ سکتے ہیں یہ وہ مقام اعلیٰ ہے جہاں عقل پسندی کا زور ٹوٹ جاتا ہے اور جہاں روحانی یوٹوپیا (Utopia) کی قلمرو کی حدود شروع ہوتی ہیں۔

شاہد احمد دہلوی

''حالات و آثار''

از

ڈاکٹر سید محمد عارف

قیمت:- ۲۰۰/ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان- ڈی- ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال کراچی ۷۵۳۰۰

اقبال اور اردو

تحریر و تحقیق: فلک شیر لیل

دنیائے علم و ادب کے شناوروں میں غالب اور اقبالؒ کے بارے میں بوجوہ یہ تصور عام پایا جاتا ہے کہ دونوں اپنے فارسی کلام پر نازاں رہے اور اپنے کلام کو اردو کے بجائے فارسی کی میزان پر تولنے، پرکھنے اور جانچنے پر اصرار کرتے رہے۔

اقبال نے ۱۹۳۷ء میں یوم غالب کے موقع پر ''انجمن اردو'' لاہور کو ایک ایسا ہی پیغام دیا جو غالب اور خود اُن کے فارسی کلام کا مؤید ہے۔ اُن کے اس پیغام کو سیکرٹری انجمن میاں بشیر احمد نے پڑھ کر سنایا۔ الفاظ یہ تھے۔

''اپنا پیغام تو میں کیا دوں گا؟ البتہ غالب کا پیغام اُن لوگوں تک پہنچا دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں جو آج ''یومِ غالب'' منا رہے ہیں۔

اُن کا پیغام یہ ہے:۔

''بگزر از مجموعۂ اردو کہ بی رنگ من است''

مرزا غالب آپ کو اپنے فارسی کلام کی طرف دعوت دیتے ہیں۔''(۱)

اقبالؒ کے یہ احساسات اُس دور کے ہیں جو اب نہیں رہا۔ نئے تقاضوں اور حالات نے بالکل ایک نیا رُخ اختیار کر لیا ہے۔ آج پاکستان میں فارسی زبان عملاً اردو کے سہارے زندہ ہے۔ فارسی سمجھنے والے لوگ اُنگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں اور نئی نسل کو فارسی پڑھنے سے کوئی خاص رغبت نہیں ہے۔ یہاں بہت سے سوالات اُٹھائے جا سکتے ہیں کہ واقعی اقبالؒ اپنے روحانی استاد غالب اور اپنے فارسی کلام کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہتے تھے یا اُنھوں نے یہ پیغام وسیع تناظر میں دیا؟

کیا اقبال کی نظروں میں اپنا اور غالب کا اردو کلام بے وقعت تھا؟ کیا اُنھیں اردو کی نسبت فارسی زیادہ عزیز تھی؟ اور سب سے بڑھ کر یہ بات کہ کیا اقبال دُور اندیش نہیں تھے؟

اگر اقبالؒ کی پوری زندگی کو سامنے رکھا جائے تو یہ سارے سوالات بے حقیقت نظر آتے ہیں کیوں کہ اُن کے قول و عمل سے ثابت ہوتا ہے کہ اُنھیں اردو زبان ادب سے اتنا ہی اُنس تھا جتنا فارسی و عربی سے..... اُنھوں نے اردو میں جو کچھ کہا

وہ علمی و ادبی لحاظ سے ادب عالیہ کا گراں قدر حصہ ہے اور آج کے ماحول میں ایک کثیر طبقہ اُن کے اردو کلام سے اکتسابِ فیض کر رہا ہے۔

اُنھیں اچھی طرح علم تھا کہ کسی قوم کی روایات واقدار، تہذیب و تمدن، مذہب و سیاست، اخلاق واطوار اور علم وادب کی سب سے بہتر امین، پاس دار اور ترجمان زبان ہوتی ہے۔ چنانچہ جب قائداعظمؒ نے زور دے کر یہ کہا تھا کہ پاکستان کی قومی و سرکاری زبان اردو اور صرف اردو ہو گی تو اُن کی اِس آواز میں اقبالؒ کی آواز بھی شامل تھی۔ ۲فروری ۱۹۳۸ء کو قائداعظمؒ کی ایک تقریر اخبار میں شائع ہوئی۔ نذیر نیازی نے اقبال کو تقریر پڑھ کر سنائی تو آپ دو باتوں پر بہت خوش ہوئے۔

> ''ایک تو جناح کے اس کہنے پر کہ بندے ماترم سے شرک کی بُو آتی ہے۔ دوسرے اس پر کہ ہندی ہندوستانی کی تحریک دراصل اردو پر حملہ ہے اور اردو کے پردے میں اسلامی تہذیب پر۔''(۲)

قائداعظمؒ نے ''خطوطِ اقبالؒ بنام قائداعظم'' کے دیباچہ میں اعتراف کیا ہے کہ اُن (اقبالؒ) کے خیالات

> پورے طور پر میرے خیالات سے ہم آہنگ تھے۔''(۳)

اقبالؒ کا شروع میں یہ خیال تھا کہ اُن کا فارسی کلام تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہے لیکن جب مدیر ''مخزن'' شیخ عبدالقادر نے اُن کی توجہ اردو کی جانب مبذول کرائی تا کہ ہندی مسلمان وطن پرستی کے جذبات سے معمور ہو سکیں تو وہ آمادہ ہو گئے۔ بانگ درا کے دیباچہ میں شیخ موصوف نے اقبالؒ کی فارسی کی طرف رغبت کا ذکر کر کے خدا کا شکر کیا ہے کہ کس طرح اقبالؒ کا اشہبِ قلم اردو کی طرف گامزن ہوا؟ کیا یہ آسان کام ہے کہ کسی شاعر سے اُس کی دلی خواہش کے بغیر اپنی من پسند زبان کے اشعار نکلوائے جائیں اور وہ ایسے موزوں کلام میں ڈھل جائیں جن کی مثال نہ مل سکے۔

بلاشبہ شیخ عبدالقادر کا یہ عظیم کارنامہ ہے کہ اُنھوں نے اقبالؒ کو شعر گوئی ترک کرنے کے ارادہ سے باز رکھا اور ان کے اردو شاعری کے پہلے مجموعہ کو شائع کرنے کا شرف حاصل کیا لیکن اقبالؒ نے بھی دل و جان اور مستقل مزاجی سے اردو میں اپنے تمام خیالات منتقل کر کے اردو سے وفا کا ساری زندگی وعدہ نبھایا۔

اردو سے بھرپور محبت کا یہی احساس تھا کہ وہ کہہ اُٹھے:

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائی دل سوزیٔ پروانہ ہے(۴)

اقبالؒ نے داغ دہلوی جیسے مُسلّم الثبوت اُستاد سے اپنی شاعری پر اسی لیے مہر تصدیق ثبت کروائی کہ اُن کا دعویٰ تھا:

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستان میں دھوم ہماری زبان کی ہے(۵)

داغ فارسی آمیز اردو سے پرہیز کے قائل تھے چنانچہ کہتے تھے:

کہتے ہیں اسے زبان اردو
جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا(۶)

اقبال کو داغ کی شاگردی پر فخر بھی تھا اور عقیدت بھی۔ اُن کے دل میں داغ کا بے حد احترام تھا جب داغ اس دنیا سے اُٹھ گئے تو انتقال کی خبر ملتے ہی تاریخ وفات نکالی ''نواب مرزا داغ'' اور داغ کے نام وہ شاہکار نظم کردی جس کے چند درد بھرے اشعار یہ ہیں:

چل بسا داغ آہ! میت اس کی زیب دوش ہے!
آخری شاعر جہان آباد کا خاموش ہے!
ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون؟
اُٹھ گیا ناوک فگن، مارے گا دل پر تیر کون؟
اشک کے دانے زمینِ شعر میں بوتا ہوں میں
تو بھی روائے خاکِ دلّی! داغ کو روتا ہوں میں
وہ گل رنگیں ترا رُخصت مثال بُو ہوا
آہ! خالی داغ سے کاشانۂ اردو ہوا(۷)

برصغیر پاک و ہند میں جب تحریکِ آزادی نے شدّت اختیار کی تو دیگر کئی مسائل کے ساتھ زبان کے مسئلہ نے بھی سیاسی صورت اختیار کرلی بلکہ زبان نے حصول آزادی میں مہمیز کا کام کیا۔ میاں بشیر احمد نے اپنے ایک مضمون ''اقبال کی یاد میں'' لکھا ہے کہ ایک دفعہ میں نے گاندھی جی کے اردو سے معاندانہ روّیہ کا ذکر کیا تو کہنے لگے:

''ڈرو مت تمھاری قوم اور زبان اس طرح مٹائے سے مٹیں گی نہیں۔''(۸)

اقبالؒ نے زبان کے بارے میں جو خطوط مولوی عبدالحق کو لکھے وہ بہت واضح، وقیع اور جان دار ہیں..... چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''بہر حال اگر اردو کانفرنس کی تاریخوں تک میں سفر کے قابل ہو گیا تو انشااللہ! ضرور حاضر ہوں گا لیکن اگر حاضر نہ بھی ہو سکا تو یقین جانیے کہ اس معاملے میں کلیتہً آپ کے ساتھ ہوں، اگرچہ میں اردو زبان کی بحیثیت زبان خدمت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا تاہم میری لسانی عصبیت دینی عصبیت سے کسی طرح کم نہیں۔''(۹)

یہاں ''لسانی عصبیت'' اور ''دینی عصبیت'' کے الفاظ معمولی نہیں ہیں بلکہ گہرے غور و فکر کے متقاضی ہیں۔ یہ اُس دور کا خط ہے جب اردو ہندی جھگڑا عروج پر تھا اور علامہ کی خواہش یہ تھی کہ انجمن ترقیٔ اردو کا دفتر لاہور (پنجاب) میں قائم کیا جائے۔ اسی سلسلہ میں بابائے اردو کی یوں حوصلہ افزائی کرتے ہیں:

''آپ کی تحریک سے مسلمانوں کا مستقبل وابستہ ہے..... یہ تحریک اُس تحریک سے کسی طرح کم نہیں جس کی ابتدا سر سید نے کی تھی۔''(۱۰)

ایک اور خط میں یوں رقم طراز ہیں۔

''کاش! میں اپنی زندگی کے باقی دن آپ کے ساتھ رہ کر اردو کی خدمت کر سکتا۔''(۱۱)

اقبالؒ اور مجاہد اردو مولوی عبدالحق کے تعلقات کی بنیاد اردو زبان سے گہری وابستگی پر اُستوار تھی۔ اُن کا یہ بیان کتنا دل چسپ اور بصیرت افروز ہے کہ:

''مولوی عبدالحق کو مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد سے بذاتِ خود کوئی تعلق نہیں تھا مگر جب خود اُن کے اپنے معبود (اردو) پر زد پڑی تو وہ اس تحریک میں شامل ہونے پر مجبور ہوئے۔''(۱۲)

اردو زبان کی بقا کی جنگ میں اقبال کی مسلسل حمایت نے مولوی عبدالحق کو مزید اعتماد بخشا۔ اُنھیں یقینِ کامل تھا کہ قوموں کی یگانگت میں زبان کے کردار کو اوّلیت حاصل ہوتی ہے۔ اُس قوم کا مستقبل ہمیشہ تابناک ہوتا ہے جو اپنی زبان کو ملّی تشخص میں نمایاں مقام دیتی ہیں۔ اسی لیے تو ایک اور خط میں اقبالؒ نے مولوی مرحوم کی یوں ہمت بندھائی:

''اردو زبان کے تحفظ کے لیے جو کوششیں آپ کر رہے ہیں، اُن کے لیے مسلمانوں کی آیندہ نسلیں آپ کی شکر گزار ہوں گی۔''(۱۳)

اقبالؒ کے ہاں اکثر نشستوں میں مختلف مباحث زیرِ غور لائے جاتے تھے۔ مارچ ۱۹۳۸ء کی ایک محفل میں اُنھوں نے فرمایا:

''انگریزوں نے باوجود سلطنت مغلیہ کے زوال و انتشار کے..... یہ ملک مسلمانوں سے چھینا تھا۔ مسلمانوں کے لسانی اور تہذیبی غلبہ کو وہ اپنے لیے ایک خطرہ تصور کرتے تھے۔ لہٰذا اُنھوں نے بڑی تندہی سے اردو کو فروغ دیا تا کہ مسلمانوں کا رشتہ فارسی اور عربی سے کٹ جائے اور وہ اپنے علمی اور تہذیبی ورثہ سے محروم ہو جائیں مگر پھر اسی اردو سے جب مسلمانوں کے شعورِ ملّی کو تقویت پہنچی اور وہ ان کی قومی زبان بن گئی تو یہ امر طبعاً حکومت کو ناگوار گزرا اور اب اس نے اردو کے مقابلہ میں ہندی کی حمایت شروع کر دی۔''(۱۴)

گویا اقبال اردو کو محض ایک زبان کا درجہ نہیں دیتے تھے بلکہ یہ ایک مکمل تہذیب کی نمایندہ اور برتر علامت تھی۔

اقبالؒ جب حصولِ تعلیم کے لیے یورپ گئے تو انھوں نے سفر کے حالات نہایت شگفتہ اور دلنشین انداز میں ہفت روزہ ''وطن'' کے ایڈیٹر مولوی انشاالله خان کو لکھے۔ ان خطوط میں اُن کی اردو سے پیار کی جھلک دیکھیے:

''ہوٹل کے نیچے مسلمان دکاندار ہیں۔ میں نے دیکھا ہر روز گجراتی اخبار پڑھتے ہیں۔ میں نے ایک روز اُن سے پوچھا۔ تم اردو پڑھ سکتے ہو؟ کہنے لگے نہیں۔ سمجھ سکتے، پڑھنا نہیں جانتے۔ میں نے پوچھا کہ مولوی جب تمھارا نکاح پڑھاتا ہے تو کون سی زبان بولتا ہے؟ مسکرا کر بولا ''اردو'' یہاں ہر کوئی اردو سمجھ سکتا ہے اور ٹوٹی پھوٹی بول بھی لیتا ہے۔''(۱۵)

ایک دوسرے خط میں ایک مصری دکاندار کے بارے میں اس طرح خوشی کا اظہار کرتے ہیں:

''تعجب ہے کہ یہ شخص ٹوٹی پھوٹی اردو بولتا تھا۔ جب وہ میرے اسلام کا قائل ہوا تو یہ جملہ بولا ''تم بھی مسلم۔ ہم بھی مسلم''۔ تو مجھے بڑی مسرت ہوئی۔''(۱۶)

اردو زبان کے خمیر میں دنیا کی دوسری کئی زبانوں کے علاوہ عربی، فارسی اور ہندی کا بالترتیب بہت بڑا حصہ ہے اس لیے اقبالؒ کی اردو شاعری میں بالخصوص عربی و فارسی کے الفاظ و تراکیب بالکل فطری طریقہ سے داخل ہو کر پُرزور اور شیریں بن گئے ہیں۔ اُنھوں نے مقداری اور معیاری لحاظ سے اردو زبان کے ذخیرۂ الفاظ، رعب و دبدبہ، آن بان، سلاست و لطافت اور شرف و آبرو میں بے بہا اضافہ کیا۔ جب علامہ کی اردو شاعری پر فارسی آمیز ہونے کا اعتراض لگا تو فرمایا:

''میری تہذیب ایک مرکب تہذیب ہے۔ اس کی روح عربی ہے مگر اس کا لباس ترک و تتار اور خراسان و اصفہان نے تیار کیا ہے۔ میں جو اردو لکھتا ہوں، میری تہذیب کی نمایندگی کرتی ہے اور میں اس کو چھوڑ نہیں سکتا۔''(۱۷)

اُن کی اردو نثر کے بارے میں سید عبداللہ لکھتے ہیں:

''اردو نثر میں حضرت علامہ نے اگرچہ کم لکھا لیکن وہ علمی اسلوب کا ایک منفرد رنگ اردو نثر کو دے گئے ہیں جو اُن کے پیغام اور اُن کی مرغوب تہذیب دونوں کا ترجمان ہے۔''(۱۸)

وہ کتنا عظیم انسان تھا جس کی نجی محفلوں میں پنجابی زبان کا راج ہوتا تھا لیکن وجدانی اور فیضانی لمحات میں اردو زبان کے وہ آبدار موتی نطق سے جھڑتے تھے جن کی تابانی سے اک جہان روشن ہے۔

یہ اردو زبان کا اقبالؒ ہے کہ اُسے موجودہ دور کا سب سے بڑا دانش ور میسر آ گیا۔ قائداعظمؒ، بابائے اردو اور اقبالؒ نے جس اخلاص اور شدومد کے ساتھ اردو زبان کے فروغ، وقار، حرمت اور ضرورت کو پاکستانی قوم کے لیے لازم جانا، پاکستانی

قوم کے طاقتور طبقات اور مغرب پسندوں نے اِسے اتنا ہی محدود، بے وقار، بے حرمت اور بے ضرورت ثابت کرنے کی عملی کوششیں کیں۔ ڈر ہے یہ بے بصری، بے توفیقی، بے تعلقی، بے حسی، بے تدبیری اور بے جراتی (معاذ اللہ) کہیں بڑی تقصیر نہ بن جائے۔ اردو تو متاعِ کارواں ہے جسے حرزِ جاں بنا کر ہی قوم صحیح معنوں میں قوم کہلا سکتی ہے۔

حواشی:

(۱) بحوالہ، ماہنامہ، عکسِ صادق، صادق آباد، غالب نمبر، ص ۱۱

(۲) ملفوظاتِ اقبال، از ابواللیث صدیقی، ص ۲۲۔ ۳۳۳

(۳) بحوالہ کورس اقبالیات۔ ایف۔ اے۔ یونٹ ۱۰۔ ۱، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد۔ ص ۱۴۱

(۴) بانگ درا، نظم، مرزا غالب، ص ۲۷

(۵) بحوالہ ہمارے شاعر، از حیات سیال، ص ۶۰

(۶) بحوالہ ہمارے شاعر، از حیات سیال، ص ۶۰

(۷) بانگ درا، ص ۹۰۔ ۸۹

(۸) ملفوظاتِ اقبال، مضمون، اقبال کی یاد میں۔ ص ۵۳۔

(۹) ملفوظات، ص ۲۲

(۱۰) ملفوظات، ص ۲۲

(۱۱) ملفوظاتِ اقبال، ص ۳۳۳

(۱۲) ملفوظاتِ اقبال، ص ۵۴۷

(۱۳) ملفوظاتِ اقبال، ص ۲۲

(۱۴) ملفوظاتِ اقبال، ص ۵۴۸

(۱۵) کورس، اقبالیات، ص ۲۴۔ ۱۸

(۱۶) کورس، اقبالیات، ص ۲۴۔ ۱۸

(۱۷) ملا وجہی سے عبدالحق تک۔ از سید عبداللہ، ص ۲۷۳

(۱۸) ملا وجہی سے عبدالحق تک۔ از سید عبداللہ، ص ۲۷۳

استفادہ:

(۱) سکسینہ، رام بابو، تاریخ اردو، غضنفر اکیڈمی پاکستان کراچی، (س۔ن)

(۲) سیال، محمد حیات، ہمارے شاعر، نذر سنز اینڈ پبلشرز، اردو بازار، لاہور۔ ۱۹۷۶ء

(۳) سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔ ۲۰۰۰ء

(۴) صدیقی، ابواللیث، ڈاکٹر، ملفوظاتِ اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔ (س۔ن)

(۵) عبداللہ، سید ڈاکٹر، ''وجہی سے عبدالحق تک''، مکتبہ خیابان ادب، لاہور۔ ۱۹۷۷ء

(۶) عروج، عبدالروف، رجالِ اقبال، نفیس اکیڈمی، اردو بازار کراچی۔ ۱۹۸۸ء

(۷) متفرقات۔ بانگ درا، ماہنامہ عکسِ صادق، غالب نمبر، صادق آباد، کورس انٹرمیڈیٹ، اقبالیات، یونٹ ۱ تا ۱۸، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد ۱۹۹۷ء

انتخابِ کلام ناسخ

تدوین و مقدمہ

رشید حسن خان

قیمت =/۱۲۰ روپے

انجمن ترقی اُردو پاکستان ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال کراچی ۷۵۳۰۰

اقبال کا مردِ مومن

صادق حسین طارق

اقبال کا مردِ مومن کیا ہے؟ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے ہمیں اس کے فلسفۂ خودی میں غوطہ زن ہونے کی ضرورت پڑے گی۔ چوں کہ مومن حق وہی شخص ہو سکتا ہے جو عرفان خودی کا عرفان رکھتا ہے اور اس کی جملہ صفات آفتاب خودی کی کرنیں ہوں۔ ہمیں علم ہے کہ خودی کوئی جامد فلسفہ نہیں بلکہ یہ ایک جذبۂ محرکہ ہے جو ہر لحہ ترقی پذیر ہے۔ اور یہ ترقی کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک انسان دنیا میں نیابتِ خداوندی کے منصب جلیلہ پر فائز ہو کر کائنات کی تسخیر کرے اور اس پر قابض ہو جائے اس بنا پر مردِ مومن کسی منزل پر بھی تھک ہار کر بیٹھ نہیں جاتا۔ اس کا کردار اور صلاحیتیں ہر لحہ ترقی کرتی چلی جاتی ہیں۔ اور ہر لحظہ وہ ایک نئی شان اور عظمت کے ساتھ سامنے آتا ہے:

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

مردِ مومن اللہ تعالیٰ کا نائب ہے۔ تمام عناصرِ قدرت اس کے مطیع و فرمانبردار ہیں وہ ان کو اپنے عمل و علم اور جذبۂ عشق کے ذریعے مسخر کرتا ہے اور انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے عشق ہی وہ قوت پیدا کی ہے جو زمان و مکان کی ہر رکاوٹ پر غالب آجاتی ہے۔ اور مردِ مومن کے جذبۂ عشق و شوق کے سامنے راستے کی تمام مشکلات و مصائب پرِ کاہ کی حیثیت نہیں رکھتیں۔

خدا کا نائب ہونے کی حیثیت سے اس کا ہر قول اور ہر فعل خدا کی منشا و مرضی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس کا ہر عمل خدا کے ارادے کا اظہار اور اس کی گفتار اللہ کی برہان ہے۔ اس کے عمل و کردار اللہ کی عظمت و کبریائی کا مظہر اور اس کا دل نورِ الٰہی سے منور و روشن ہوتا ہے۔ گویا کہ مردِ مومن کا وجود دنیا میں وجودِ باری تعالیٰ کی ناقابلِ تردید شہادت و برہان ہے:

گفتار میں کردار میں اس کی برہان

وہ مجسم جلال بھی ہے اور پیکرِ جمال بھی۔ اس کی ذات میں روح القدس کا ذوقِ جمال عجم کا حسنِ طبیعت اور عرب کا سوزِ دروں منعکس ہوتا ہے:

عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال
عجم کا حسنِ طبیعت عرب کا سوزِ دروں

مردِ مومن قرآنی آیات کے مطابق اپنے مسلمان بھائیوں کے حق میں شفقت و راحت کا پیکر اور رحمت و ہمدردی کا مجسمہ اور دشمنانِ دین

اور ملت اور کفر و باطل کے موت و ہلاکت کا پیغام ہے۔ وہ لوگوں کے قصور معاف کرنے والا، خطا کاروں سے در گزر کرنے والا اور اللہ پر ایمان لانے اور اس کا تقویٰ اختیار کرنے کی صورت میں وہ خالق کائنات کے قانون سے سرِ مو انحراف نہ کرنے والا ہے۔ وہ ہمیشہ غلامی سے نفور اور آزادی و حریت کا شیدائی ہوتا ہے:

قہاری و جباری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

مرد مومن در حقیقت سب سے بہادر اور شجاع ہوتا ہے۔ اسے اپنے اللہ پر ایمان ہوتا ہے اور جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو موت یا زندگی اس کے لیے لکھ دی ہے وہ ہو کر رہے گی اسی بنا پر اسے اپنے نفس پر مکمل قابو ہوتا ہے۔ وہ حق و باطل کے معرکوں میں کود پڑتا ہے۔ وہاں چٹان کی طرح ڈٹ جاتا ہے۔ اور علائے کلمۃ الحق کے لیے وہ ہر قسم کے مصائب و آلام کو بڑی خندہ پیشانی اور خوشی سے برداشت کرتا ہے۔ اور یہی چیز اسے کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کر دیتی ہے۔ اور غلبۂ حق کی ایک لازمی شرط یہ بھی ہے کہ حق کے پرستار باہم محبت و شفقت اور رحمت و رافت کا سلوک کریں۔ ان کے ہاتھوں اور زبانوں سے دوسرے مسلمان محفوظ و مامون رہتے ہیں۔ بلکہ ہر مومن کی ذات ساری ملتِ اسلامیہ کے لیے سلامتی کی علامت ہوتی ہے اسی بنا پر اقبالؒ اپنے مرد مومن کی صفات یوں گنواتا ہے:

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

مرد مومن خود آگاہ و خدا مست ہوتا ہے۔ بے شک وہ جسمانی طور پر خاک سے پیوند رکھتا ہے، لیکن روحانی طور پر اس کا ربط خالقِ کائنات سے استوار ہوتا ہے۔ وہ اپنے اعلیٰ کردار کی بدولت سب مخلوق سے اعلیٰ و ارفع ہوتا ہے۔ وہ مادی کائنات میں رہنے کے باوجود محکوم مادہ نہیں ہوتا۔ وہ تمام مادی امتیازات سے ماورا ہوتا ہے۔ رنگ و نسل، خون، وطن، علاقہ اور زبان کے تمام رشتے اس کے سامنے کچھ حیثیت نہیں رکھتے بلکہ وہ سب سے بالاتر ہو کر آفاقی سوچ سوچتا ہے وہ سب انسانوں کو اپنا بھائی سمجھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اللہ کے نزدیک مکرم و افضل تو وہی شخص ہے جو زیادہ متقی ہے۔ اقبال نے اس پہلو سے مومن کی تعریف یوں کی ہے:

ہمسایۂ جبریلِ امیں بندۂ خاکی
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشاں
درویش خدا مست نہ شرقی نہ غربی
گھر میرا نہ دلی، نہ صفاہاں نہ سمرقند

اس کی یہی امتیازی خصوصیت اس کے عالمگیر غلبہ و اقتدار کی ضامن ہے۔ اس امتیازی خصوصیت کی محور ذات رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہے، جو شخص حلقہ بگوش محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہو جاتا ہے۔ وہ عالمگیر اسلامی برادری کا رکن بن جاتا ہے! اسے تمام مسلمانوں جیسے

حقوق مل جاتے ہیں۔ وہ تمام مادی علائق سے کٹ کر صرف مسلمان رہ جاتا ہے۔ اسی بنا پر قوم پرست مسلمانوں کو اقبال کہتے ہیں:

تو ابھی رہگذر میں ہے قید مقام سے گزر
مصر و حجاز سے گزر پارس و شام سے گزر

مردِ مومن کی زندگی قرآن کا عملی نمونہ ہے۔ اس کا قول و فعل قرآن کی ترجمان ہے:

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

وہ اللہ کا نائب ہے لہٰذا وہ انقلاباتِ زمانہ اور زمانہ کا پیروکار نہیں وہ حادثاتِ زمانہ کا شکار نہیں وہ قدرت کا ایک ایسا نشان ہے جسے دیکھ کر دوسری اقوام عالم اپنے لیے بہتر راہ عمل کا انتخاب کر سکتی ہیں۔ اسی بنا پر عروج و ترقی کے امکانات وجودِ مومن میں مضمر ہیں۔ وہ دنیا کو تہذیب و تمدن، عزت و اقبال سیاست و جہانبانی، تجارت و معاش، عدل و انصاف، مساوات و حریت، اخوت و محبت، رحمت و رافت، تمدن و معاشرت کے اصول سکھانے آیا ہے۔ جنھیں اپنا کر دنیائے انسانیت امن و سکون، رفعتِ وقار، ترقی و سرفرازی اور عزت و تکریم پا سکتی ہے۔

قدرت کے مقاصد کے عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

مطبوعاتِ انجمن ترقی اُردو کے لیے لکھے گئے پیش لفظ کا مجموعہ

حرفے چند

از

جمیل الدّین عالی

قیمت حصّہ اوّل =/۱۰۰ روپے، حصّہ دوم =/۱۲۵ روپے، حصّہ سوم =/۱۰۰ روپے

شائع کردہ
انجمن ترقی اردو پاکستان ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشنِ اقبال کراچی ۷۵۳۰۰

گذشتہ سال جدا ہم سے ہو گئے یہ لوگ.....

۲۰۰۰ء

شمیم صبائی متھراوی

(۲۳)

"سبیلِ تربتِ شورش ملک"

۲۰۰۰ء

لے اڑی شورش ملک کو اف اجل
تھے صحافت کے جہاں کے وہ فلک
ان کی تاریخ فنا لکھ دے شمیم
"کوکبِ جنت ہوئے شورش ملک"

۱۴۲۰ھ

(سینیئر صحافی، روزنامہ، "جنگ راولپنڈی کے سابق ایڈیٹر اور روزنامہ "نوائے وقت" کے مدیر، اکادمی ادبیات پاکستان کے سابق چیرمین جناب شورش ملک نے ۱۷ مارچ ۲۰۰۰ء مطابق ۲۰ ذی الحج ۱۴۲۰ھ بروز جمعہ بعمر ۶۹ سال راولپنڈی میں انتقال فرمایا۔)

(۲۴)

"تربتِ محب طنز و مزاح شفیق الرحمن"

۲۰۰۰ء

چل بسا ایک شہِ طنز و مزاح
ہو گیا قصرِ ظرافت ویران
لکھیے تاریخ فنا ان کی شمیم
"میرِ فردوس شفیق الرحمن"

۱۴۲۰ھ

(ممتاز مزاح نگار، افسانہ نگار، اکادمی ادبیات پاکستان کے پہلے چیرمین، میجر جنرل (ر) شفیق الرحمن نے ۱۹ مارچ ۲۰۰۰ء مطابق

۱۲ ذی الحج ۱۴۲۰ھ بروز اتوار بعمر ۸۰ سال راولپنڈی میں رحلت کی۔ مرحوم کو پیر کے دن ریس کورس قبرستان پنڈی میں سپردِ لحد کیا گیا۔)

(۲۵)

"مرقدِ مفتی عبدالرشید راشد"

۲۰۰۰ء

کر گئے انتقال اف راشد
لے اڑا ان کو موت کا قاصد
ان کا سالِ فنا شمیم ملا
"نوحۂ دردِ رحلتِ راشد"

۱۴۲۰ھ

(ممتاز ادیب و شاعر، متعدد کتابوں کے مصنف مفتی عبدالرشید راشد نے ۲۲ مارچ ۲۰۰۰ء مطابق ۱۵ ذی الحج ۱۴۲۰ھ بروز بدھ بعمر ۹۵ سال ہری پور میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کو ان کے آبائی قبرستان پشاور میں سپردِ خاک کیا گیا۔)

(۲۶)

"نورِ تربتِ دانش پناہ صلاح الدین عادل"

۲۰۰۰ء

صلاح الدین عادل باغ دنیا سے سدھارے
ملا ان کو بحکم رب مکانِ خُلدِ زیبا
شمیم ان کے لیے تاریخ رحلت کی یکایک
ملی "موتِ صلاح الدین عادل والا رتبہ"

۱۴۲۰ھ

(ممتاز ادیب، ناول نگار، شاعر اور مترجم جناب صلاح الدین عادل نے ۶ اپریل ۲۰۰۰ء مطابق ۲۶ ذی الحج ۱۴۲۰ھ بروز اتوار بعمر ۷۸ سال لاہور میں وفات پائی۔)

(۲۷)

"رحلتِ ذی شان انعام الحق"

۲۰۰۰ء

رنج و غم کا باعث طہری
رحلتِ خوش خو انعام الحق

سالِ مرگ شمیم نے پایا
"تربتِ حق جو انعام الحق"

۱۴۲۰ھ

(انگریزی اور اردو کے ممتاز شاعر، قائداعظم لائبریری لاہور کے بانی ایر کموڈور (ر) انعام الحق نے ۱۳ اپریل ۲۰۰۰ء مطابق ۷ ذی الحج ۱۴۲۰ھ بروز پیر بعمر ۷۹ سال لاہور میں انتقال فرمایا۔)

(۲۸)

"منزلِ قبر علامہ غلام علی اوکاڑوی"

۲۰۰۰ء

تج کے باغِ جہان کو افسوس
دے گئے اپنا غم غلام علی
یوں شمیم ان کا سالِ مرگ ملا
"اہلِ ملک عدم غلام علی"

۱۴۲۰ھ

(پاکستان کے معروف عالمِ دین شیخ القرآن علامہ غلام علی اوکاڑوی نے ۱۶ مئی ۲۰۰۰ء مطابق ۱۱ صفر المظفر ۱۴۲۱ھ بروز منگل بعمر ۸۰ سال لاہور میں رحلت فرمائی۔ ان کا جسد خاکی اوکاڑہ لے جایا گیا بدھ کے دن جامعہ اشرف المدارس میں سپردِ خاک کیا گیا۔)

(۲۹)

"ہے ہے غمِ قتلِ مولانا یوسف لدھیانوی"

۲۰۰۰ء

کون دہشت گرد تھا جس نے چلا کر گولیاں
توڑ ڈالا زندگیٔ عالمِ نامی کا ساز
قتلِ مولانا پہ آ کر بولا رضواں یوں شمیم
"یوسف لدھیانوی ہیں خلد میں مجلس طراز"

۱۴۲۱ھ

(ممتاز عالمِ دین اور مجلس تحفظ ختم نبوت کے نائب امیر مولانا یوسف لدھیانوی نے دہشت گردوں کے ہاتھوں ۱۸ مئی ۲۰۰۰ء مطابق ۱۳ صفر المظفر ۱۴۲۱ھ بروز جمعرات کراچی میں رحلت فرمائی۔ مرحوم کو اسی رات مسجد خاتم النبیین اسکاؤٹ کالونی گلشن اقبال میں سپردِ خاک کیا گیا۔)

(۳۰)

"شاعرِ انجمن گاہ خُلد مجروح سلطان پوری"

۲۰۰۰ء

شاعرِ شیریں بیاں رخصت ہوا
کون جانے اب کہاں مجروح ہے
یوں کہا رضوانِ جنت نے سمیم
"طالبِ باغ جناں مجروح ہے"

۱۴۲۱ھ

(اردو کے ممتاز شاعر جناب مجروح سلطان پوری نے ۲۴ مئی ۲۰۰۰ء مطابق ۱۹ صفر المظفر ۱۴۲۱ھ بروز بدھ بعمر ۸۹ سال ممبئی (بھارت) میں انتقال فرمایا۔)

(۳۱)

"دلدوز رحیلِ حافظ شیر عالم مجددی"

۲۰۰۰ء

شیرِ عالم جہان سے اُٹھ کر
پا گئے عالمِ مرادِ خُلد
سالِ رحلت شمیم ان کا لکھو
"شیرِ عالم ہوئے عمادِ خُلد"

۱۴۲۱ھ

(ممتاز عالمِ دین، مذہبی اسکالر، جماعت اہلِ سنت کے مرکزی رہنما، دارالعلوم مجددیہ کے بانی و مہتمم اور جامع گلزارِ مدینہ ڈھوک دلاں، کی مسجد کے خطیب الحاج حافظ شیر عالم مجددی نے ۲۵ مئی ۲۰۰۰ء مطابق ۲۰ صفر المظفر ۱۴۲۱ھ بروز جمعرات بعمر ۷۰ سال راولپنڈی میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کو جمعہ کے دن بنگش کالونی جامع غوثیہ میں سپردِ خاک کیا گیا۔)

(۳۲)

"تربت وفا کیش طاہر شادانی"

۲۰۰۰ء

طاہرِ شادانی دنیا سے گئے
خلد میں وہ اب ہیں صدر خُلد، لکھ

اے شمیم زار ان کا سالِ مرگ
"طاہر شادانی بدرِ خُلد" لکھ

۱۴۲۱ھ

(ممتاز ماہر تعلیم، ادیب، شاعر جناب طاہر شادانی نے ۳۰ مئی ۲۰۰۰ء مطابق ۲۵ صفر المظفر ۱۴۲۱ھ بروز منگل بعمر ۸۵ سال لاہور میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ مرحوم کو قبرستان میانی صاحب میں سپرد خاک کیا گیا۔)

(۳۳)

"تربتِ مخدوم عزیز صدیقی"

۲۰۰۰ء

غمِ مرگِ عزیز صدیقی
دے گیا اہل دل کو تاریکی
سال غم یوں شمیم نے پایا
"پنہاں داغِ عزیز صدیقی"

۱۴۲۱ھ

(معروف صحافی اور ہیومین رائٹس کمیشن آف پاکستان کے جوائنٹ ڈائریکٹر جناب عزیز صدیقی نے ۷ جون ۲۰۰۰ء مطابق ۳ ربیع الاول ۱۴۲۱ھ بروز بدھ بعمر ۶۶ سال لاہور میں رحلت کی۔ مرحوم کو قبرستان میانی صاحب میں سپردِ لحد کیا گیا۔)

(۳۴)

"آوازۂ مرگِ صدر شام حافظ الاسد"

۲۰۰۰ء

شام کے صدر چل بسے افسوس
رنج کی ہر طرف فضا چھائی
ان کی تاریخِ غم شمیم حزیں
"لاشۂ حافظ الاسد" پائی

۱۴۲۱ھ

(شام کے صدر جناب حافظ الاسد نے ۱۰ جون ۲۰۰۰ء مطابق ۶ ربیع الاول ۱۴۲۱ھ بروز ہفتہ بعمر ۶۹ سال دمشق میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کو منگل ۱۳ جون کو ان کے آبائی گاؤں تروہا میں سرکاری اعزازات کے ساتھ سپرد خاک کیا گیا۔)

(۳۵)

"ارتحالِ نیک نام مولانا ناظم ندوی"

۲۰۰۰ء

ناظم ندوی اٹھے اُف
بدلی چھائی ہے غم کی
ان کا سالِ رحلت ہے

"ناظم ندوی فردوسی"

۱۴۲۱ھ

(ممتاز عالمِ دین اور مولانا ابوالحسن ندوی مرحوم کے قریبی ساتھی مولانا ناظم ندوی نے ۱۰جون ۲۰۰۰ء مطابق ۶ربیع الاول ۱۴۲۱ھ بروز ہفتہ بعمر ۸۷ سال کراچی میں رحلت فرمائی۔)

(۳۶)

"غلام محی الدین شاہ زاہدِ جنت"

۲۰۰۰ء

اٹھ گئے علامہ جس دم دہر سے
دین کے حلقوں نے پائی غم کی راہ
ان کا سالِ مرگ یوں ڈھونڈا شمیم
"شارحِ جنت محی الدین شاہ"

۱۴۲۱ھ

(بانی و مہتمم ادارہ ضیاالعلوم راولپنڈی، شیخ الحدیث علامہ پیر غلام محی الدین شاہ نے ۱۶جون ۲۰۰۰ء مطابق ۱۲ربیع الاوّل ۱۴۲۱ھ بروز جمعہ بعمر ۸۲ سال راولپنڈی میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ مرحوم کی میت کو آپ کے آبائی گاؤں سلطان پور (ہروئی والا) حسن ابدال میں سپردِ خاک کیا گیا۔)

(۳۷)

"گردِ قبر حضور احمد شاہ صاحب"

۲۰۰۰ء

جب اٹھے دہر سے حضور احمد
اور پکڑی انھوں نے خلد کی راہ

سالِ رحلت شمیم ان کا ملا
"زیبِ کوچ حضور احمد شاہ"

۱۴۲۱ھ

(کراچی پریس کلب کے سابق صدر اور سنیئر صحافی جناب حضور احمد شاہ نے ۱۷ جون ۲۰۰۰ء مطابق ۱۳ ربیع الاول ۱۴۲۱ھ بروز ہفتہ بعمر ۸۰ سال کراچی میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کی میت ذریعہ طیارہ کراچی سے پشاور لے جائی گئی اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔)

(۳۸)

"سبیلِ مزار افتخار احمد صدیقی صاحب"

۲۰۰۰ء

اُٹھ گئے افتخار صدیقی
کر گئے اشک بار، لکھ دینا
سال رحلت شمیم تم ان کا
"صدمۂ افتخار" لکھ دینا

۱۴۲۱ھ

(شعبۂ اردو پنجاب یونی ورسٹی، اورینٹل کالج کے سابق استاد اور قومی اقبال ایوارڈ یافتہ اقبال شناس ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے ۱۸ جون ۲۰۰۰ء مطابق ۱۴ ربیع الاول ۱۴۲۱ھ بروز اتوار بعمر ۸۳ سال لاہور میں رحلت فرمائی۔)

(۳۹)

"روشن تربتِ اہلِ صفا دانیال لطیفی"

۲۰۰۰ء

افسوس دانیال لطیفی بھی چل بسے
چھائے ہیں اہل پاک پہ صدموں کے سائے اب
تاریخ انتقال شمیم ان کی یوں ملی
"تربت میں دانیال لطیفی ہیں ہائے اب"

۱۴۲۱ھ

(قائداعظم کے قریبی ساتھی، برصغیر کے عظیم مجاہد آزادی، نامور مسلم لیگی اور تحریک پاکستان کے دوران مسلم لیگ کے منشور کے مصنف جناب دانیال لطیفی نے ۲۲ جون ۲۰۰۰ء مطابق ۱۸ ربیع الاول ۱۴۲۱ھ بروز جمعرات دہلی (بھارت) میں انتقال فرمایا۔)

(۴۰)

"مزار نیک سیرت نواب صادق حسین قریشی"

۲۰۰۰ء

اٹھ گئے صادق قریشی بھی بساطِ دہر سے
چھوڑ کر دنیا میں اپنا نام عالی چل بے
یوں شمیم ان کی ہمیں تاریخ رحلت غیب سے
مل گئی "عالی منش صادق قریشی چل بے"

۱۴۲۱ھ

(پنجاب کے سابق گورنر اور وزیر اعلیٰ نواب صادق حسین قریشی نے ۲۶ جون ۲۰۰۰ء مطابق ۲۲ ربیع الاول ۱۴۲۱ھ بروز پیر بعمر ۷۴ سال لاہور میں رحلت فرمائی۔ مرحوم کو ۲۷ جون منگل کے دن ان کے آبائی قبرستان ملتان میں سپردِ خاک کیا گیا۔)

(۴۱)

"پر نور تربتِ علّن فقیر"

۲۰۰۰ء

فوک کا نامی گلوکار اٹھ گیا
کہہ رہی ہے رحلتِ علّن فقیر
ان کی تاریخ اجل تو اے شمیم
لکھ "ملالِ فرقتِ علّن فقیر"

۱۴۲۱ھ

(پاکستان کے نامور فوک گلوکار جناب علّن فقیر نے ۴ جولائی ۲۰۰۰ء مطابق یکم ربیع الآخر ۱۴۲۱ھ بروز منگل بعمر ۷۰ سال کراچی میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کو بدھ کے دن ایمپلائیز ہاؤسنگ سوسائٹی سندھ یونی ورسٹی جام شورو میں واقع ان کے ذاتی گھر کے احاطے میں دفنایا گیا۔)

(۴۲)

"لالہ صحرائی کی بے مثال تربت"

۲۰۰۰ء

لالہ صحرائی دنیا سے گئے
راحتِ جنت انھوں نے پائی ہے

ان کی تاریخ جدائی لکھ شمیم
"ہائے داغ لالۂ صحرائی ہے"

۱۴۲۱ھ

(ممتاز نعت گو شاعر اور ادیب چودھری محمد صادق المعروف لالۂ صحرائی نے ۷ جولائی ۲۰۰۰ء مطابق ۲۴ ربیع الآخر ۱۴۲۱ھ بروز جمعہ بعمر ۸۰ سال ملتان میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ مرحوم کی میت ان کے آبائی شہر جہانیاں لیجائی گی جہاں ہفتہ کے دن انھیں سپرد لحد کیا گیا۔)

(۴۳)

"نوشاد نوری ہادیٔ باغ فردوس"

۲۰۰۰ء

اٹھ گئے نوشاد نوری جب بساطِ دہر سے
جب انھیں خُلد بریں میں گوشۂ راحت ملا
دفعتاً ملہم کی جانب سے ہمیں بھی اے شمیم
سالِ غم "نوشاد نوری افسرِ جنت" ملا

۱۴۲۱ھ

(بنگلہ دیش میں مقیم اردو کے مشہور نظم گو شاعر جناب نوشاد نوری نے ۱۷ جولائی ۲۰۰۰ء مطابق ۱۴ ربیع الآخر ۱۴۲۱ھ بروز پیر بعمر ۷۱ سال ڈھاکہ میں رحلت فرمائی۔)

(۴۴)

"راحتِ جنت علی سردار جعفری"

۲۰۰۰ء

دنیا سے جب اٹھے علی سردار جعفری
اور ان کے واسطے سبھی محفل بہشت کی
تاریخ انتقال لکھی یوں شمیم نے
"فردوس، مجلس علی سردار جعفری"

۱۴۲۱ھ

(برصغیر کے ممتاز ترقی پسند شاعر مصنف اور عہد ساز شخصیت جناب علی سردار جعفری نے یکم اگست ۲۰۰۰ء مطابق ۲۹ ربیع الآخر ۱۴۲۱ھ بروز منگل بعمر ۸۷ سال ممبئی (بھارت) میں انتقال فرمایا۔)

رفتار ادب

(تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

شاہد احمد دہلوی

ڈاکٹر سید محمد عارف
صفحات: ۳۲۸، قیمت: دوسو روپے
ناشر: انجمن ترقی اردو پاکستان
ڈی-۱۵۹، بلاک ۷ گلشن اقبال، کراچی

شاہد احمد دہلوی مرحوم کا نام اردو ادب کے محسنوں میں آتا ہے۔ انھوں نے زبان و ادب کی کئی حیثیتوں سے خدمت کی اور زندگی بھر کرتے رہے۔ ایک زمانہ تھا جب ان کے رسالہ "ساقی" کا طوطی بولتا تھا اور اس میں چھپنا ادیبوں اور شاعروں کے لیے باعث افتخار ہوتا تھا۔ ماہنامہ "ادب لطیف" اور مولانا صلاح الدین احمد کے "ادبی دنیا" کی طرح "ساقی" نے بھی بہت سے لکھنے والوں کو متعارف کرایا۔ اس طرح ادبی مدیر کی حیثیت سے انھوں نے اردو ادب کی ترویج و ترقی میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیا۔ آپ کی ادبی جہتیں متعدد ہیں۔ خاکہ نگاری کے میدان میں آپ کا نام نمایاں ہے انھوں نے جن شخصیات کے خاکے لکھے ہیں، انھیں جیتا جاگتا لاکڑھا کیا ہے۔ "اجڑا دیار" میں دہلی کی تہذیب و ثقافت کو پوری جزئیات کے ساتھ اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ وہاں کی رسوم و رواج کے ساتھ ساتھ تہوار منانے کے طور طریقے اور کرخنداری بولی کی بھرپور جھلکیاں سامنے آجاتی ہیں۔ شاہد احمد دہلوی کا رپورتاژ "دلی کی بپتا" آج بھی مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی ترجمہ نگاری بھی منفرد ہے اور انھوں نے انگریزی زبان سے جو ادب پارے اردو میں منتقل کیے ہیں وہ محض ترجمہ ہی نہیں بلکہ ان میں تخلیقی انداز ملتا ہے۔ انھیں زبان و بیان پر جو قدرت حاصل تھی وہ بہت کم لکھنے والوں کو حاصل ہے۔ جن لوگوں نے شاہد مرحوم کی تحریروں کا مطالعہ کیا ہے وہ اس بات سے باخبر ہوں گے کہ آپ کو موسیقی پر بھی دسترس حاصل تھی۔ عملی طور پر اور فنی طور پر بھی انھیں کلاسیکی موسیقی پر عبور حاصل تھا۔ اس طرح ان کی علمی، ادبی اور فنی خدمات کا دائرہ وسیع ہے اور پیش نظر کتاب "شاہد احمد دہلوی۔ حالات و آثار" اسی نامور شخصیت کے بارے میں ہے۔ دراصل یہ سید محمد عارف کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر انھیں ڈاکٹریٹ کی سند ملی ہے۔ کتاب کے پہلے باب میں شاہد احمد دہلوی مرحوم اور ان کے خاندان کے حالات و واقعات ہیں۔ دوسرا باب ماہنامہ "ساقی" کے حوالے سے تحریر کیا گیا ہے جس میں اس رسالے کی ادبی خدمات کے ساتھ ساتھ ادبی معرکوں کا بیان بھی ہے۔ تیسرا باب "خاکہ نگاری" پر مشتمل ہے جس میں شخصیت نگاری کے موضوع پر اس صنف کے مختلف پہلوؤں پر لکھا گیا ہے۔ چوتھا باب "شاہد احمد دہلوی" ثقافت دہلی کا مورخ و مصور کے عنوان سے ہے جس میں دہلی کی تاریخ، تہذیب، ثقافت اور روایات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس سے اگلا باب شاہد صاحب کی "رپورتاژ نگاری" کے بارے میں ہے اور اس کے بعد

ترجمہ نگاری کے فن کا جائزہ لیتے ہوئے ان تراجم کی تفصیل بیان کی گئی ہے جو انھوں نے کیے تھے۔ پھر فن موسیقی میں آپ کی مہارت کے متعلق لکھا گیا ہے اور آخری ابواب میں شاہد احمد دہلوی کی شخصیت اور آپ کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ آپ کا طرز نگارش، انداز ترجمہ، اسلوبِ تحریر اور زبان و بیان کی خوبیوں کے بارے میں ان کی اپنی تحریروں کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔ مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ "دور حاضر میں اگر اسلوب کی دلکشی برقرار رکھنی ہے تو شاہد احمد دہلوی اور ان جیسے ادیبوں کے اسالیب کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔" شاہد احمد دہلوی دلی کی ٹکسالی زبان لکھتے تھے اور انھیں شستہ نگاری بلکہ شگفتہ نگاری میں ملکہ حاصل تھا۔ ان کو زبان و بیان پر اس قدر کمانڈ تھی جو ان کے ہم عصروں میں کم کم نظر آتی ہے۔ یہ کتاب تحقیقی مقالہ تو ہے ہی مگر یہ ایک بڑی ادبی شخصیت کی ادبی، علمی اور فنی خدمات کا اعتراف بھی ہے۔

(شین عین)

انگلیاں فگار اپنی

ضمیر نیازی

صفحات: ۱۳۲، قیمت: ۸۰ روپے

۱ ۳۱۹۔ مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر کراچی ۷۴۴۰۰

کتاب کا نام غالب کے اس مصرع "انگلیاں فگار اپنی خامہ خوں چکاں اپنا" کا نصف حصہ ہے اور اُنھوں نے اپنے وضاحتی اور نسبتاً طویل مضمون کے عنوان "بول کہ لب آزاد ہیں تیرے" کے توسط سے فیض احمد فیض کو یاد کیا ہے۔ یوں جدوجہد آزادی کی ایک مختصر تاریخ مرتب ہو گئی ہے کتاب کے نام اور مضمون محولہ کے عنوان سے ضمیر نیازی کی غالب و فیض سے محبت و شیفتگی ظاہر ہوتی ہے۔

ضمیر نیازی صاحب کی انگریزی اور اُردو صحافت میں جو گراں قدر خدمات ہیں اُن کی وجہ سے اس بندۂ جری کے کار قلم کا ہر اُس شخص کی نظر میں احترام ہے جو صحافت و ادب سے کسی نہ کسی عنوان منسلک ہے۔ اُن کی پہچان صحافتی و ادبی دنیا میں ایک نڈر صحافی کی حیثیت سے مسلّم ہو چکی ہے۔ جب ہم پچھلے پچاس، پچپن سال کی صحافتی دُنیا پر نظر کرتے ہیں تو ضمیر نیازی کی حیثیت Avant - Garde کے طور پر اُبھرتی ہے۔ آج تک کسی عنوان کا Temptation اُن کی مستحکم شخصیت کو ٹس سے مس نہ کر سکا۔ اُنھوں نے کتاب کے آغاز میں "غیر منقسم ہندوستان کے پہلے اور آخری شہدائے صحافت مولوی محمد باقر (مدیر دہلی اخبار۔ ش ۱۸۵۷ء) اور مولانا مظہر الدین (مدیر "الامان" اور "وحدت"۔ ش ۱۹۳۸ء) کی یاد میں جو فارسی قول "ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما" رقم کیا ہے اس کا اطلاق خود ضمیر نیازی پر بھی اُن کی صحافتی خدمات کی وجہ سے کیا جاسکتا ہے۔

"انگلیاں فگار اپنی" کے متن میں، جابجا جو موقف بیان ہوتے گئے ہیں وہ اس بات پر دال ہیں کہ اُن کا بیان کرنے والا، ملک کے بدلتے ہوئے معاشرتی، معاشی، اور سیاسی حالات پر گہری نظر رکھتا ہے۔ بظاہر ضمیر نیازی کا موقف حد درجہ قوی اور اندر کا پروردہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اُن کے اظہاری تجربات و مشاہدات سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اُن کے اس اندر کی تعمیر باہر کے عوامل سے ہوئی ہے۔ اس ضمن میں دلچسپ پہلو یہ ہے کہ بادی النظر میں جس شے کو ہم اندر کی دین سمجھتے ہیں، جب اس کے اور چھور کا پتا لگائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی باہر موجود ہے۔ اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں باہر ہی کا تناظر معاشرہ کی تشکیل میں مدد دیتا ہے، بیدل نے بھی اپنے مقالات میں ایک جگہ کہا ہے:

"جزوی و کلی مشاہدہ کے بغیر دل میں تصور کا نزول ممکن نہیں"

بات معاشرے کی تشریح سے نکل کر اندر اور باہر کی توضیح کرتی ہوتی کہاں سے کہاں نکل گئی۔

اُنگلیاں فگار اپنی میں کیا کچھ ہے؟ تو جواباً عرض ہے کہ بہت کچھ ہے اور بہت کچھ کو تبصرے میں سمیٹنا آسان نہیں۔ لہذا میں مندرجات پر فرداً فرداً بات کرنے کے بجائے محض مضامین کے عنوانات رقم کیے دیتا ہوں، کہ اچھے عنوانات بھی جسم تک پہنچنے کے لیے پہنچے پکڑنے کے مترادف ہیں،

۱) بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
۲) سچ کی آزادی زندہ رہے گی
۳) یہ قانون زباں بندی...
۴) آزادی کے سپاہی اور بھاڑے کے ٹٹو
۵) ڈان ایک عہد کی کہانی
۶) میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں
۷) لاؤ تو قتل نامہ ذرا
۸) اس دشمن وفا سے بڑے معرکے رہے
۹) نیاز و فگار: فکر نو کے علم بردار
۱۰) لڑتے ہیں، اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں
۱۱) کہ خوشی سے مر نہ جاتے...

ضمیمہ نمبر ۱..... بندۂ مزدور کے اوقات

ضمیمہ نمبر ۲..... اظہار حق کی اپنے قلم میں قلم لگا

"اُنگلیاں فگار اپنی" ملکی و بین الملکی حالات کو سمجھنے کے لیے سمت نمائی کا کام دیتی ہے، ہم اس سے مقیاس و پیمانہ کا کام بھی لے سکتے ہیں، اس کے سیاسی مزاج اور ہوا کے رُخ کا بھی ادراک کر سکتے ہیں۔ غرضیکہ یہ کتاب بڑی افادیت رکھتی ہے۔

(ا۔س)

رباعیات خوش حال خاں خٹک

مرتب و مترجم: پروفیسر محسن احسان

صفحات: ۲۲۴، قیمت: ۱۵۰ روپے

پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی پشاور

"رباعیات خوش حال خاں خٹک" کے مندرجات کے متعلق کچھ کہنے سے پہلے اِس امر کی داد و تحسین ضروری ہے کہ اِس میں خوش حال خاں کی ۱۳۴۴ رباعیات کے اردو تراجم شامل ہیں، اور یہ پہاڑ سی کاوش کا سہرا پروفیسر محسن احسان کے سر جاتا ہے، بلکہ یہ مبالغہ نہ سمجھا جائے تو میں کہوں کہ یہ کام "کاہ کندن کوہ بر آوردن" کے مصداق ہے۔ بے شک خوش حال شناسی کے باب میں یہ ایک

اہم کام ہے۔ اور پشتو سے اُردو میں کسی ادب پارے کا منتقل کیے جانے کا عمل بہ احسن وہی انجام دے سکتا ہے جو دونوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھتا ہو، اور بے شک و شبہ محسن احسان صاحب ایک طرف پشتو پر عالمانہ دسترس رکھتے ہیں دوسری طرف اُردو کے بڑے شاعر شمار ہوتے ہیں۔

سرحد کے دو عظیم شاعر رحمان بابا اور خوش حال خاں خٹک اپنے ملک سے نکل کر بیرون ملک بھی تسلیم کیے جاتے ہیں۔ خوش حال خان کا اختصاص یہ ہے کہ ایک طرف وہ شمشیر کے دھنی تھے، اُن کا مجاہدانہ جوہر میدان کارزار میں کھلتا تھا، دوسری طرف میدان کارزار کی سرگرمیوں کے دباؤ اور تناؤ کو کم کرنے کے لیے رباب اور سارندہ سے کھیلتے تھے، اور شاعری کو حرزِ جاں بنا رکھا تھا۔

علامہ اقبال کے اس شعر کے مخاطب شاید خوش حال خاں ہیں:

کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

یہ کہنا بہ ظاہر بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن بلبل فقط آواز اور طاؤس "فقط رنگ" کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے، چین میں عوامی جدوجہد نے آزادی کی تمام تر جدوجہد میں لانگ مارچ کرنے والے عوامی دستوں کے لیے چنگ و تفنگ کو شانہ بہ شانہ رکھا۔

میں جب خوش حال خاں کا خیال کرتا ہوں تو مجھے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ بڑے جرنیل تھے یا بڑے شاعر! میں نے کتاب میں شامل رباعیوں کے سیاق و سباق پر سرسری نظر دوڑائی، مقصد یہ تھا کہ اِن کی رباعیوں کے ہجوم میں اِس قبیل کا کوئی مضمون نظر آجائے جس میں "شمشیر و سنان اوّل طاؤس و رباب آخر" کے مفاہیم کا اظہار ہوا ہو۔ میں اِس جستجو میں ناکام رہا (یہ بھی ممکن ہے میری نگاہ سہو کر گئی ہو)۔

خوش حال خاں کی شاعری کے جو طور طریقے اور شاعری کے جو موضوعات تھے کم و بیش سب پر اُنھوں نے طبع آزمائی کی۔ چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُن کی شاعری ہمہ جہت، ہمہ رنگ و ہمہ وصف ہے، جرات اظہار اس پر مستزاد ہے۔

اِس کتاب کے لیے ایک بھرپور دیباچہ ڈاکٹر راج ولی شاہ خاں صاحب نے تحریر فرمایا ہے۔ رباعیات کے انتخاب اور تراجم کی نظرثانی میں، جناب محسن احسان نے اپنے رفیق پروفیسر حبیب الرحمن کے تعاون کا اعتراف کیا ہے۔

بہرحال پروفیسر محسن احسان نے خوش حال خاں خٹک کی ۱۳۴۴ رباعیات کو اُردو میں منتقل کر کے ہم جیسے اُردو والوں پر احسان کیا ہے جو پشتو سے نابلد ہیں۔ اِس ترجمے کے توسط سے ہمیں اِس عظیم شاعر کو بہت قریب سے محسوس کرنے کا موقع فراہم ہوا ہے۔ خوش حال خاں کو اُردو دنیا سے متعارف کرانے میں فارغ رضا پیش پیش رہے ہیں۔

(ا۔ س)

میری ناکام زندگی

اختر حامد خاں
صفحات: ۱۲۶، قیمت: ۸۰ روپے
۳۱۶۔ مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر کراچی ۷۴۴۰۰

"میری ناکام زندگی" اختر حامد خاں صاحب نے قلم سے نہیں کیمرے سے لکھا ہے! لکھنے کی رفتار کچھ ایسی ہی رہی ہے، ۱۲۶

صفحات کی ضخامت میں اپنے مشاہدات کی کائنات بھر دی ہے۔ میرا اشارہ ۱۸۵۷ء کے بعد کی زوال آمادگی سے حصول آزادی پاک و ہند تک کے کوائف کی طرف ہے۔ کم الفاظ میں اس جدوجہد کے زندہ کرداروں کی چہرہ کشائی کی ہے۔ اور ایسے اسلوبِ نگارش میں کہ یہ سعادت خال خال افراد کے حصے میں آتی ہے۔ انگریزی میں ایسے ہی اسلوب کے لیے لفظ Lively استعمال ہوتا ہے۔

اس کتاب میں جن بھائی صاحب کا ذکر بار بار شروع سے آخر تک آتا اور بہر عنوان آتا رہا ہے یعنی اختر حمید خاں صاحب، اُن کا ایک نظارہ میں نے ڈھاکے میں بہت قریب سے کیا ہے ایک ریستوران میں چائے کی پیالیوں کے درمیان۔ کومیلا سے خاں صاحب اپنے کسی کام سے ڈھاکے آئے ہوئے تھے۔ صلاح الدین محمد کو اُن کی آمد کی خبر لگ گئی۔ اُن سے خاں صاحب کی یاد اللہ تھی۔ اُنھوں نے چائے پر ایک نشست طے کرلی۔ اور مجھے بھی اختر حمید خاں صاحب سے ملوانے کے لیے لے گئے۔ وہیں صلاح الدین اُن سے حالات حاضرہ پر گفتگو کرتے رہے، میں خاموش تماشائی، صلاح الدین کی نظم نگاری اُن دنوں زوروشور سے ہو رہی تھی۔ چناں چہ انھوں نے چند اک تازہ نظمیں سُنائیں۔ پھر ازراہ قدردانی، اختر حمید خاں صاحب سے بھی کلام سنانے کی درخواست کی گئی۔ خود خاں صاحب کا ذوق شعری بھی کم نہ تھا۔ وہ فرد فرد شعر سُناتے رہے اور پھر یہ سہ فریقی نشست، ہنسی خوشی میں ختم ہوئی۔

پھر اُن سے ڈھاکے میں دوبارہ ملنے کا موقع ہاتھ نہ آیا۔ کراچی کے اورنگی پائیلٹ پروجیکٹ میں خاں صاحب کی موجودگی میرے خبروں میں رہی، عام افراد کے بھلے کی کارگزاریوں کی رپورٹیں سُنتا رہا، خوش ہوتا رہا۔ لیکن نہ جانے کیوں یہ توفیق نہ ہوئی کہ تجدید ملاقات کی صورت نکالتا۔ دراصل کراچی ایسا بھاگم بھاگ کا شہر ہے کہ بس ہر کوئی بھاگ رہا ہے، کسی کو پلٹ کر دیکھنے کی فرصت نہیں۔ اور اب تو وہ ہمارے درمیان بھی نہیں، اورنگی پائلٹ پروجیکٹ ہی کے احاطے کو آخری آرام گاہ بنا کر اختر حمید خاں ابدی نیند سو رہے ہیں۔

اختر حامد خاں نے اگرچہ اس کتاب زیر تبصرہ کا نام "میری ناکام زندگی" رکھا ہے۔ لیکن اس کے متون کے مطالعے سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ وہ ایک کامیاب شخص ہیں۔ ان کے رختِ سفر میں چند قابلِ ذکر تصانیف ہیں۔ اُنھوں نے خاکوں کی کتاب شائع کی۔ ناول لکھا، اور دیگر نوعیت کے مضامین اپنے ذخیرہ تحریر میں شامل کیے۔ میں اپنی اس بات کو ایک بار پھر دہراتا ہوں کہ اختر حامد خاں کے ہاتھ میں جو قلم ہے وہ کیمرہ تکنیک سے کام کرتا ہے، تحریر دیکھنے کے بجائے تصویر دیکھنے کا لطف آتا ہے۔ میں اس میں سوڈیڑھ سو برس کے قومی تاریخ کے پنورما سے محظوظ ہوا ہوں۔ گویا اس کوزے میں ایک زمانہ سما گیا ہے۔ اللہ کرے حسنِ رقم اور زیادہ!

(ا۔س)

پھول، تتلیاں اور بچے
(بچوں کی کہانیاں)

نسیم نیشو فوز
صفحات: ۱۲۴، قیمت: ۱۰۰ روپے
۵/۹- باغِ رضواں، گلشن اقبال نمبر ۱۶، کراچی

نسیم نیشو فوز جانے پہچانے قلم کار ہیں۔ ایک عرصے سے لکھ رہے ہیں۔ موضوعات کے اعتبار سے ان کی تحریروں میں ایک

تنوع ہے، ٹی وی کے لیے سیریل لکھے، ریڈیو کے لیے ڈرامے تحریر کیے، بچوں کے لیے ان کے لکھے ہوئے پروگرام نشر ہوتے رہے۔ ان کے مزاج کا جھکاؤ فنونِ لطیفہ کی طرف ہے اور فنون لطیفہ میں بھی مصوری پر انھوں نے زیادہ کچھ لکھا۔ خود انجمن کے مجلہ "قومی زبان" میں ان کے درجنوں مضامین مصوری اور مصوّر کے حوالے سے شائع ہو چکے ہیں۔

نسیم نیشو فوز انگریزی کے اُستاد ہیں، برسوں سے دہلی کالج میں پڑھا رہے ہیں۔ خاموش طبع ہیں، علمی و ادبی اعتبار سے جتنا کچھ ہیں اُس سے خود کو کم ظاہر کرنے میں طمانیتِ قلب محسوس کرتے ہیں۔

اُن کی تازہ تصنیف "پھول، تتلیاں اور بچے" پیش نظر ہے۔ اس میں سولہ کہانیاں شامل ہیں، کہانیوں کے انتخاب و ترتیب میں ان کے دیرینہ یار قیصر امام گیلانی، حسن اکبر کمال اور امان الحق نے ہاتھ بٹایا ہے۔ کتاب کی خوبی یہ ہے کہ بچوں کے تفہیمی معیار کو زبان کے برتنے میں پیش نظر رکھا ہے۔ قاری کو لغات سے کہیں واسطہ نہیں پڑتا۔ ہر کہانی بچوں کے لیے کوئی نہ کوئی درس کا پہلو رکھتی ہے۔

یہ کہانیاں اُن بوڑھوں کے لیے بھی ہیں جو ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ چکے یا اس سے تجاوز کر چکے ہیں۔ گاہے گاہے رات کے سناٹے میں وہ بھی کبھی پلنگ پر پڑے پڑے کہانی سننے کو مچل جاتے ہیں۔ ایسے میں عالم طفلی کی کہانی سنانے والی دادیاں اور نانیاں یاد آتی ہیں۔ اس تشنگی کو تسکین فراہم کرنے کے لیے یہ مشغلہ نہایت تیر بہ ہدف ہے۔ کہ پھول اور تتلیاں پڑھنے لگ جاتے۔

بہ قول مصنف بچوں کی یہ کہانیاں عالمی کینویس کو نظر میں رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ اور یہ بات ایک حد تک درست ہے کہ نسیم نیشو فوز صاحب کی ان کہانیوں کو پڑھ کر "چیزے دیگر" کا احساس ہوتا ہے، کہانیوں کے ڈسکورس میں، برتاوے میں مصنف نے بہ طور خاص اِس بات کا خیال رکھا ہے کہ اِس میں جدت اور تازہ دمی کی لہریں موجود ہوں۔ یہ ۱۸۶۲ء کی سُنی ہوئی کہانیاں نہ لگیں۔ ۱۸۶۲ء یہاں محاورتاً آیا ہے جاگڑپن اور قدامت ظاہر کرنے کے لیے۔

مختصر یہ کہ آج بھی جب بچوں کی تعلیم و تربیت اور اُن کی اصلاحِ احوال و اخلاق کی بات آئے گی تو اُنھیں ان کی درستگی کے لیے نسیم نیشو فوز کی بچوں کی کہانیاں، بہترین حوالہ بنیں گی۔

(ا۔ س)

صحرا میں جگنو

یعقوب تصور

صفحات: ۱۳۶، قیمت: ۱۲۰ روپے

ایوان ادب، ۴ ایف ناظم آباد۔ ۷۴۶۰۰

اُردو میں ہائیکو اب نئی صنف ادب نہیں رہی ہے، غیر ملکی اصنافِ ادب میں سب سے زیادہ پذیرائی ہائیکو کے حصے میں آئی۔ اس کی ترویج کے لیے جاپانی کونسلیٹ کوئی نہ کوئی تقریب برپا کرتی رہتی ہے۔ پورے پاکستان میں ہائیکو کہنے والوں کی تعداد سینکڑوں تک جا پہونچی ہے۔ کراچی کا جریدہ "ہائیکو انٹرنیشنل" (مدیر سہیل احمد صدیقی) ہائیکو کی ترویج و اشاعت کے لیے مختص ہے۔ بہت سے اُردو شعرا و شاعرات کے ہائیکو کے مجموعے منظر عام پر آکر داد حاصل کر چکے ہیں، اُردو سے نکل کر پاکستان کی علاقائی زبانوں، سندھی، بلوچی، اور پنجابی میں بھی ہائیکو لکھی جا رہی ہے۔ پنجابی زبان میں ہائیکو کی شکل و صورت سے ملتی جلتی ایک صنف ماہیا پہلے ہی

سے موجود ہے۔ ہائیکو پر یہاں یونیورسٹی کی سطح کا کام بھی ہو چکا ہے۔

ہائیکو کے پُرانے پارکھ ڈاکٹر محمد امین کے بقول "صحرا میں جگنو" کتاب کا بڑا مناسب نام ہے۔ در حقیقت ہائیکو جگنو کی سی جلتی بجھتی کیفیت کی حامل ہے۔ یعقوب تصور نے ہائیکو نگاری کے لیے دو طرح کے اوزان منتخب کیے ہیں بحر خفیف اور پانچ۔ سات، پانچ کی ہیت! کتاب کا آغاز بحر خفیف فاعلاتن، مفاعلن فعلن سے ہوا ہے۔

اِسی بحر میں ایک حمدیہ ہائیکو ملاحظہ کیجیے:

بارہا کیوں لگے مجھے ایسا
دھڑکنوں کی حسیں صداؤں میں
جیسے آواز دے رہا ہو خدا

ایک حمد مروجہ بحر ۵-۷-۵ میں:

رقت طاری ہو
جب دل کی گہرائی سے
حمد باری ہو

جناب محسن بھوپالی نے اس کتاب کے لیے دیباچہ لکھا ہے، محسن بھوپالی کو اس کا حق پہنچتا ہے۔ ہائیکو کے باب میں محسن صاحب کا علم اسناد کے درجے کو پہنچ چکا ہے۔ وہ اس صنف لطیف کی کنہیات سے بہ خوبی واقف ہیں۔ انھوں نے اُردو کے بحر متقارب کے ایک رُکن فعلن کو دو سلیبل کے مساوی گردانا ہے، اِس طرح مروج ہائیکو کی بہ اعتبار وزن و بحر یہ صورت بنتی ہے:

"فع-لن فع- لن-فع =۵
فع- لن-فع- لن "فع- لن-فع =۷
فع- لن-فع- لن-فع=۵

یعقوب تصور کے مذکورہ دونوں بحروں میں سینکڑوں ہائیکو نظمیں کتاب میں شامل ہیں، ان کی مدد سے ایک اچھا خاصا متاثر کن شعری مجموعہ ترتیب پا گیا ہے۔ ہر طرح کے مسائل ذات سے کائنات تک ان کے ہائیکو کا موضوع بنے ہیں، لیکن یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ جاپان کی یہ صنف، بہت نازک اور لطیف ہے۔ اس کے بیان میں اسی لحاظ سے صوتی کرخت کی نمائندگی کرنے والے الفاظ کے انتخاب سے بچنے کی ضرورت ہے، یہ بالش میں روئی بھرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ فوم کے ٹکڑے یا ناریل کے پھوسڑ بھرنے کا نہیں! یعقوب تصور نے اس تقاضے کو پیشِ نظر رکھا ہے۔

(ا-س)

گردوپیش

پروین شاکر کی یاد میں تقریب

۲۳فروری ۲۰۰۱ء کو نامور شاعرہ پروین شاکر کی یاد میں ایک تقریب، نیشنل لائبریری اسلام آباد کے آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی۔ جس میں انھیں بھرپور خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ چھے برس پہلے پروین شاکر کا سڑک کے حادثے میں انتقال ہوا۔ پروین شاکر ٹرسٹ کی جانب سے منعقد کی گئی اس تقریب میں جڑواں شہر اسلام آباد و پنڈی کے معزز شہری اور ادب کے باذوق حضرات جیسے ٹوٹ پڑے تھے۔

اس تقریب کی مہمان خصوصی بیگم پرویز مشرف تھیں۔ ان کے علاوہ مشہور شعرا میں احمد فراز اور افتخار عارف تشریف رکھتے تھے۔ محترمہ پروین قادر آغا اور پروین شاکر کے صاحبزادے سید مراد علی بھی اگلی نشست میں موجود تھے۔

بیگم پرویز مشرف نے اپنے خطاب میں کہا کہ پروین شاکر نے قوم کے لیے جو شعری سرمایہ چھوڑا ہے۔ اب وہ قومی ورثہ ہے، ان کی شاعری تادیر زندہ رہے گی۔ انھوں نے مزید کہا کہ بالعموم خواتین اہل قلم اور بالخصوص خواتین افسانہ و ناول نگار کی تخلیقات قومی زبان و ادب کو باثروت بنا رہی ہیں۔

جناب احمد فراز نے اپنے مختصر تخاطب میں کہا کہ پروین شاکر کی مقبولیت روز بروز فزوں ہوتی جا رہی ہے۔ فیض احمد فیض کے بعد پروین شاکر سب سے زیادہ مقبول شاعر بن کر ابھری ہیں۔

بیگم پرویز مشرف نے "پروین شاکر ٹرسٹ" کی طرف سے کوئٹہ کے شاعر محسن شکیل کو بہترین شعری مجموعہ کے انعام سے نوازا۔ دوسرا انعام مضمون کے لیے ایف سی کالج عابد مجید روڈ کے جناب صبا گل کو دیا گیا۔ اور اوّل انعام جناب زاہد حسین کے حصے میں آیا۔

آخر میں بیگم پروین قادر آغا نے پروین شاکر ٹرسٹ کی جانب سے ایک شیلڈ مہمان خصوصی بیگم پرویز مشرف کو پیش کی۔

(رپورٹ: روزنامہ "ڈان"، ۲۴فروری ۲۰۰۱ء)

انجمن ترقی پسند مصنفین کے تحت اجلاس

انجمن ترقی پسند مصنفین کا ایک اجلاس پی ایم اے ہاؤس میں شوکت صدیقی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر حنیف فوق اور بھارت کے معروف شاعر امام علی نقوی نے اس نشست میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ اس اجلاس میں پروفیسر محمود ساجد نے "۲۰۰۱ء کا انسانی منظرنامہ" کے موضوع پر ایک جامع مقالہ پیش کیا۔ جس میں پروفیسر ساجد نے برصغیر میں افسانوی ادب

کی تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جیسے جیسے ادب کی تاریخ میں ادب برائے ادب سے ادب برائے زندگی کی طرف سفر شروع ہوا۔ ادب اور شاعری میں مقصدیت شامل ہوتی گئی بلکہ ادب زندگی کا ترجمان بن کر ابھرا۔ ڈاکٹر حنیف فوق نے ڈاکٹر محمود ساجد کے تجربے کو ایک اچھی اور کامیاب کوشش قرار دیتے ہوئے کچھ فرو گزاشتوں کی طرف مقالہ نگار کی توجہ دلائی۔ صدر اجلاس شوکت صدیقی نے پروفیسر محمود ساجد کی کوششوں کی تعریف کرتے ہوئے کہ اب علامتی ادب کے حصار سے نکلنے کی ضرورت ہے۔ اب اہل قلم کو نہ صرف انسانوں کی زندگی کے المیوں کی ترجمانی کرنی چاہیے بلکہ انھیں اس بات کا احساس بھی دلانے کی ضرورت ہے کہ وہ ظلم و استحصال کے نظام کو مقدر سمجھ کر قبول کرنے کی بجائے اس کے خلاف جدوجہد کریں اس سلسلے میں انھوں نے اپنے شہرہ آفاق ناول "خدا کی بستی" کا حوالہ دیا جس کے نام پر لوگوں نے بستیاں بسائیں۔ بھارت سے آنے والے ممتاز شاعر امام علی نقوی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا اور تنقید برائے تنقید کے رویے پر افسوس کا اظہار کیا۔ اجلاس میں مسلم شمیم، صبا اکرام، مجاہد بریلوی، شمشاد احمد ظہیر، اختر بیدری، صادق مدہوش، شہناز، عزیز اعظمی وغیرہ نے شرکت کی۔

(روزنامہ "جنگ"، کراچی ۲۳ فروری ۲۰۰۰ء)

استاد رشید انجم کے اعزاز میں تقریب

ممتاز شاعر اور نقاد پروفیسر سحر انصاری نے کہا ہے کہ اپنے بزرگوں اور محسنوں کو یاد رکھنا ایک اچھی روایت ہے۔ ان خیالات کا اظہار انھوں نے آرٹس کونسل میں دبستانِ مصحفی، دبستانِ وارثیہ، ینگ کلچرل ویلفیئر سوسائٹی، علی حیدر ایجوکیشنل سوسائٹی، بزمِ یاران سخن اور شہید ملت ویلفیئر سوسائٹی کے اشتراک سے استاد رشید انجم کی یاد میں منعقدہ ادبی ریفرنس میں اپنے خطاب میں کہا۔ انھوں نے کہا کہ استاد رشید انجم نے بلوچستان میں اردو زبان و ادب کی ترویج کے لیے جو خدمات انجام دی ہیں، انھیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ صدر جلسہ ممتاز شاعر اور ناقد پروفیسر جاذب قریشی نے کہا کہ استاد رشید انجم کی تمام زندگی خدمت علم و ادب میں گزری۔ ان کی شاعری میں بھی انسانی اقدار کو اہمیت دی گئی ہے۔ ممتاز شاعر، پروفیسر منظر ایوبی نے کہا کہ استاد رشید انجم کی شاعری ہر اس شخص کے دل کی آواز ہے جسے اپنی تہذیب سے محبت ہے۔ اس موقع پر اقبال حیدر، سرور جاوید، پروفیسر صدف چنگیزی، عمر گل عسکر، ڈاکٹر محمد عمران ہاشمی اور نوجوان شاعر محمد علی گوہر نے بھی خطاب کیا۔ قبل ازیں بزرگ شاعر قمر جمالی امروہوی نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ منظوم خراج تحسین ڈاکٹر نثار احمد دہلوی اور محمود احمد محور نے پیش کیا نظامت کے فرائض رشید خان رشید نے انجام دیے۔ آخر میں سید جواد حیدر نقوی نے اظہار تشکر کیا۔

(روزنامہ "جنگ"، کراچی، ۲۴ فروری ۲۰۰۱ء)

کوثر نقوی کے اعزاز میں ایک شام

حلقہ دانش کے زیر اہتمام معروف شاعر کوثر نقوی کے اعزاز میں شام ہفتہ ۲۴ فروری شام چھ بجے اے جی کالج اردو بازار ناظم آباد میں ہوئی۔ صدارت پروفیسر آفاق صدیقی نے کی جب کہ مہمان خصوصی پروفیسر جاذب قریشی تھے۔ مقررین میں حسین انجم،

پروفیسر آذر حفیظ، سرور جاوید، ذکی عثمانی، سحر تاب رومانی اور دیگر شامل ہیں۔

(روزنامہ "جنگ"، کراچی ہفتہ ۲۴ فروری ۲۰۰۰ء)

سندھ سے ناانصافیوں کا ازالہ ضروری ہے، شیخ ایاز کی سالگرہ کی تقریب سے خطاب

وفاقی وزیر قانون محترمہ شاہدہ جمیل نے کہا ہے کہ سندھ کا مستقبل پاکستان کا مستقبل ہے، اس لیے سندھ کو کسی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ سندھ کے ممتاز شاعر، ادیب اور دانشور شیخ ایاز کی سالگرہ کے موقع پر شیخ ایاز فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام سندھ میوزیم میں "شیخ ایاز کے نام ایک شام" کے حوالے سے منعقدہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے محترمہ شاہدہ جمیل نے کہا کہ پاکستان کو اکیسویں صدی کے چیلنجوں کا سامنا فروغ تعلیم سے کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ماضی میں سندھ سے ہونے والی نا انصافیوں کا ازالہ ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ شیخ ایاز نے اپنی شاعری میں ثقافتی پہچان کی بات کی ہے، یہی بات قائد اعظم نے بھی کہی تھی۔ ڈائریکٹر اکیڈمی آف لیٹر پاکستان جناب افتخار عارف نے کہا کہ سندھ سے ہونے والی زیادتیوں کے ازالے کے لیے نظام کی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ شیخ ایاز سندھ کے عظیم شاعر تھے اور وہ انھیں اپنا استاد مانتے ہیں جب کہ شیخ ایاز آخری دم تک سندھی عوام کے لیے لکھتے رہے۔ شیخ ایاز فاؤنڈیشن کے چیئرمین محمد ابراہیم جویو نے کہا کہ شیخ ایاز مرحوم کو بحیثیت ادیب و شاعر آخری دم تک اپنی ذمہ داریوں کا احساس تھا۔ انھوں نے بتایا کہ گذشتہ تین برس میں شیخ ایاز کی ۲۵ سے زائد کتابیں بازار میں آئی ہیں جن میں پانچ کتابیں فاؤنڈیشن نے شائع کرائی ہیں۔ سندھ کی ممتاز ادیبہ نورالہدیٰ شاہ نے کہا کہ شیخ ایاز کے پختہ مزار کے بجائے اس کی شاعری کو زندہ رکھنا چاہتی ہیں۔ تقریب سے پروفیسر اعجاز قریشی، غلام ربانی اگرو، تاج جویو، نصیر مرزا و دیگر حضرات نے بھی خطاب کیا جب کہ اس موقع پر شیخ ایاز سے متعلق کتابوں کی مہورت بھی کی گئی۔

(روزنامہ "جنگ"، کراچی اتوار ۴ مارچ ۲۰۰۰ء)

صدارتی اعزازات

۲۳ مارچ ۲۰۰۱ء کو ادبی خدمات کے صلے میں جن حضرات کو صدارتی اعزازات سے نوازا گیا اُن کے اسمائے گرامی:

جناب حکیم محمد سعید	نشان امتیاز (بعد از مرگ)
ڈاکٹر شفیق الرحمن	ہلال امتیاز (بعد از مرگ)
ڈاکٹر الیاس عشقی	ستارہ امتیاز
محترمہ کشور ناہید	ستارہ امتیاز
ڈاکٹر علامہ ناصر الدین ناصر	ستارہ امتیاز (بعد از مرگ)
میر گل خاں نصیر	ستارہ امتیاز (بعد از مرگ)
جناب یو آن وائی ژو کو (چین)	تمغہ حسن کارکردگی
جناب راغب مراد آبادی (پاکستان)	تمغہ حسن کارکردگی

جناب محمد شریف کنجاہی (پاکستان) — تمغہ حسن کارکردگی
جناب جون ایلیا (پاکستان) — تمغہ حسن کارکردگی
جناب شمشیر الحیدری (پاکستان) — تمغہ حسن کارکردگی
جناب رسا چغتائی (پاکستان) — تمغہ حسن کارکردگی
جناب اطہر شاہ خاں (پاکستان) — تمغہ حسن کارکردگی

گلنار آفرین کے ساتھ ایک شام

پاکستان امریکن کلچرل سینٹر نے ممتاز شاعرہ اور افسانہ نگار گلنار آفرین کی شعری و افسانوی خدمات کے اعتراف میں ایک شام کا اہتمام کیا جس کی صدارت ممتاز شاعر و ادیب محسن بھوپالی نے کی جب کہ اظہارِ خیال کرنے والوں میں پروفیسر آفاق صدیقی، پروفیسر ریاض صدیقی، پروفیسر ثروت سلطانہ اور رونق حیات شامل تھے۔ سامعین سے بھری ہوئی امریکن سینٹر کی تقریب گاہ میں ڈائریکٹر ثقافت محترمہ اسما احمد نے گلنار آفرین کی خدمات کو سراہتے ہوئے ان کا خیر مقدم کیا۔ رونق حیات نے ان کو کھری اور سچی شاعرہ قرار دیتے ہوئے ان کے ادبی کام پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر ثروت سلطانہ نے اس موقع پر گلنار آفرین کی تخلیقی ہنرمندی اور حسن کاری کے آرٹ کو سراہا اور کہا کہ ان کی شعری تخلیقات اور افسانے قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ پروفیسر ریاض صدیقی نے ان کی شاعری اور کہانی کاری کی مختلف جہتوں کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے ترقی پسندی کے حقیقی نظامِ فکر سے اپنے کمٹمنٹ کو نبھایا ہے۔ عصری موضوعات کو اعلیٰ ادبی نثر اور بول چال کے محاوروں کے ذریعے پیش کیا ہے۔ پروفیسر آفاق صدیقی نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ ان کی نظموں میں سیاسی اور مزاحمتی پہلو زیادہ حاوی ہے اور اس قسم کی نظمیں ایک خاص عہد تک تو اپنا اثر قائم رکھتی ہیں مگر بعد کے زمانوں میں ان کی حیثیت اخباری ہو کر رہ جاتی ہے۔ تقریب کی اعزازی مہمان افسانہ نگار و شاعرہ گلنار آفرین نے اسما احمد اور سامعین کا شکریہ ادا کیا اور اپنی چند غزلیں و نظمیں سنائیں تقریب کے صدر محسن بھوپالی نے کراچی کے المناک واقعات کے حوالے سے کہی گئی ان کی نظموں کا خاص طور پر احاطہ کیا انھوں نے کہا کہ گلنار آفرین نے ایسے ماحول میں جب سچ کا اظہار کرنا محال تھا بر ملا سچائی کا اظہار کیا۔ گلنار آفرین کی تخلیقی صلاحیتوں کو سراہتے ہوئے انھوں نے ان کو لمحہ موجود کی شاعرہ قرار دیا۔
(رپورٹ: اسما احمد)

تقریب بسلسلہ یوم غالب

انجمن ترقی اُردو ہزارہ ڈویژن ایبٹ آباد کے زیر اہتمام یوم غالب کے سلسلے میں ایک ادبی تقریب بمقام بار۔ کلب ایبٹ آباد بتاریخ ۲۶ فروری ۲۰۰۱ء بوقت ۴ بجے سہ پہر منعقد ہوئی۔ اس تقریب کے میزبان گل خان جدون ایڈووکیٹ تھے۔ صدارت کے فرائض مشہور ادیب پروفیسر بشیر محمود اختر نے سرانجام دیے۔ کلام پاک سے تقریب کا آغاز ہوا۔ پروفیسر صادق زاہد نے مرزا غالب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا۔ مرزا غالب برصغیر کی مسلم تہذیب و ثقافت کے وہ درخشندہ آفتاب تھے۔ جنھوں نے اردو غزل میں اسی جدت پسند طبیعت کی وجہ سے بے پناہ اضافے کیے جس کی وجہ سے آج کی جدید غزل اور اس کے مضامینِ نو غالب کی فنی

خوبیوں کی مرہون منت ہیں۔ اس طرح انھوں نے اپنے مکاتیب کے ذریعے اردو نثر کو سہل ممتنع کے قالب میں ڈھالا جس کی بازگشت آج اکیسویں صدی کے ادب میں محسوس کی جاسکتی ہے۔ پروفیسر بشیر محمود اختر نے فرمایا۔ جوں جوں عصر حاضر اپنے ارتقائی منازل طے کرتا چلا جائے گا۔ غالب کے نئے نئے مفاہیم نظم و نثر میں بخوبی محسوس کیے جائیں گے۔ مرزا غالب کی فطری جولانیاں ان کے فکر وفن کی دنیا میں زندگی کے تمام موضوعات کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ اُردو زبان و ادب ہمیشہ غالب کے احسان مند رہیں گے۔

بعدازاں محفل مشاعرہ منعقد ہوئی جس میں۔ سلطان سکون۔ گل خان جدون ایڈوکیٹ۔ سمیع اللہ ایڈوکیٹ۔ کامران مزاج اور دیگر شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

(رپورٹ: عبدالخالق شاطر ہزاروی)

مرزا غالب کی برسی کے موقع پر اُردو مرکز جدہ کا مشاعرہ

گذشتہ برس کی طرح اس سال بھی عالمی اُردو مرکز جدہ کی جانب سے غالب کی برسی کے موقع پر ایک مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس میں شعرائے کرام نے غالب کی زمینوں میں کلام پیش کیا۔ اس مرتبہ یہ مشاعرہ حامد اسلام خان کے ہاں منعقد ہوا جو کہ ناظم تقریبات ہیں اور جن کی نصف بہتر محترمہ صوفیہ حامد اُردو مرکز کے شعبۂ خواتین کی سیکریٹری ہیں۔ مشاعرہ دو ادوار پر مشتمل تھا پہلے دور میں غالب کے حوالے سے اشعار پیش کیے گئے جب کہ دوسرا دور عام مشاعرے پر مبنی تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ اب جدہ میں مشاعرہ کا آغاز دیر سے کرنے اور اس کا اختتام مزید دیر سے کرنے کا مقابلہ چل نکلا ہے۔ گزشتہ ہفتہ کا مشاعرہ شب کے تین بجے ختم ہوا تھا۔ (نظر حجازی والا) اس مرتبہ مشاعرہ چار بجے صبح تک چلا۔ آئندہ ہفتوں میں ممکن ہے ناشتے کا انتظام بھی میزبانوں کے ذمے رہے۔

غالب کی ایک سو بتیسویں برسی کے حوالے سے منعقدہ اس مشاعرے کی صدارت بزرگ شاعر جناب احمد جمال صادق نے کی اور نظامت جناب حبیب صدیقی نے کی۔ مسند پر اردو مرکز کے صدر منور ہاشمی نے صاحب صدر کو تنہائی کے احساس سے بچائے رکھا۔ تلاوت کلام پاک جناب محسن علوی نے کی جبکہ محمد نواز جنجوعہ نے غالب کی زمین میں ایک نعت خوش الحانی سے پیش کر کے اہلِ ایمان کے قلوب کو منور کیا۔ ان کے دو شعر:

ہر سمت جلوہ بار ہے رحمت حضور کی
اک دھوم ہے زمانے میں آقا کے نور کی
زمزم پیا ہے جب سے تو ایسے ہوئے ہیں سیر
حاجت نہیں ہے اب کسی جامِ طہور کی

مشاعرے میں آغاز میں اسلام خان نے خیر مقدمی کلمات کہے اور غالب کے حوالے سے بھی اظہار خیال کیا۔ محمد مختار علی نے غالب کی ایک غزل ترنم سے سنائی جبکہ ڈاکٹر اطہر نقوی نے غالب کی شخصیت اور فن کے حوالے سے ایک مقالہ پیش کیا جس میں غالب کے فلسفۂ وحدت الوجود کے حوالے سے اظہار خیال کیا گیا تھا اور غالب کے اشعار کے حوالے سے بات آگے بڑھائی گئی تھی۔

پہلے دور میں غالب کی زمینوں میں جو کلام پیش کیا گیا اس کے شرکا میں، صوت حسین، زوار قمر عابدی، مسرت حسین قریشی، محمد اسد خان، زمرد خاں سیفی، عبدالقیوم مبین، مرزا لیاقت علی بیگ نازش، عرفان پارہ بنکوی، محمد مختار علی، حامد صدیقی، انجم کاظمی،

مرزا یوسف رہبر، محسن علوی، اطہر عباسی، نسیم سحر، منور ہاشمی، قابلِ ذکر ہیں۔ صاحب صدر احمد جمال صادق کے اس شعر کے ساتھ مشاعرے کے پہلے دور کا اختتام ہوا:

کھینچا ہی کیے اہل خرد خطِّ تعین
بڑھتا ہی گیا دائرہ وہم و گماں اور

مشاعرے کا دوسرا دور شروع ہوا کم و بیش اس میں بھی انھیں شعرائے کرام نے اپنا کلام سنایا۔ جو پہلے دور میں غالب کے حوالے سے اپنا کلام سنا چکے تھے۔

انجم کاظمی نے نعتِ رسول ﷺ سنائی اور محسن علوی نے پاکستان کے حوالے سے ایک نظم۔

(نسیم سحر)

ماہر غالبیات کے انتقال پر انجمن ترقی اردو پاکستان کی تعزیت

"متعلقات غالب"، "غالبیات"، "دیوان غالب کامل" کو مرتب کرنے والے ماہرِ غالبیات جناب کالی داس گپتا رضا ہندوستان میں حرکتِ قلب بند ہونے کے سبب جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ آنجہانی کالی داس گپتا رضا نے حال میں اپنی دو کتابیں "غالب درونِ خانہ" اور "غالب کی بعض تصانیف" انجمن ترقی اردو پاکستان کو نظرِ ثانی کر کے برائے طباعت بھیجی تھیں۔ اس سے قبل تاریخی ترتیب کے ساتھ ان کی مرتب کردہ کتاب "دیوانِ غالب کامل" کو انجمن کئی سال قبل شائع کر چکی ہے۔ انجمن سے ان کا دیرینہ قلمی و قلبی تعاون رہا ہے، انھوں نے انجمن سے کبھی کوئی معاوضہ نہیں لیا۔

کالی داس گپتا رضا کے انتقال پر انجمن ترقی اردو پاکستان کا ایک تعزیتی جلسہ نائب معتمد امراؤ طارق کی صدارت میں منعقد ہوا، جس میں آنجہانی کے انتقال پر ان کی آتما کی شانتی کے لیے دعا اور ان کے اہلِ خانہ سے دلی تعزیت کا اظہار کیا گیا۔

انجمن ترقی اردو پاکستان کے صدر اعزازی جناب آفتاب احمد خاں اور معتمد اعزازی جناب جمیل الدین عالی نے بھی تعزیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کی ناگہانی موت سے اردو ادب میں خصوصاً "غالبیات" کے موضوع کو گہرا نقصان پہنچا ہے۔ جس کی تلافی ممکن نہیں ہے۔

(شہاب قدوائی)

معروف قلمی صحافی سعید امرت انتقال کر گئے

معروف سینئر صحافی ناول اور افسانہ نگار سعید امرت طویل علالت کے بعد جمعرات ۲۹ مارچ ۲۰۰۱ء کی شام ۷۲ سال کی عمر میں انتقال کر گئے انھیں معدے کا السر تھا۔ مرحوم نے صحافتی زندگی کا آغاز دہلی سے کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد قلمی و ادبی جریدے "روماں" سے منسلک ہو گئے اور آخر تک اس سے وابستہ رہے، ان کے متعدد ناول اور افسانوں کے مجموعے بھی شائع ہوئے۔ مرحوم نے اہلیہ کے علاوہ دو بہنیں اور دو بھائی سوگوار چھوڑے ہیں۔ انھیں بعد نمازِ عشاء میوہ شاہ قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

(روزنامہ "جنگ"، کراچی ۳۰ مارچ ۲۰۰۱ء)

سر سید احمد خاں

حالات و افکار

بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

قیمت:-/۷۵ روپے

انجمن ترقی اُردو پاکستان، ڈی-۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال کراچی-۷۵۳۰۰

اردو شعرا کے تذکرے

اور

تذکرہ نگاری

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

قیمت:-/۲۵۰ روپے

انجمن ترقی اُردو پاکستان، ڈی-۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال کراچی-۷۵۳۰۰

اطرافِ رشید احمد صدیقی

مصنف: اسلوب احمد انصاری

قیمت:-/۱۰۰ روپے

انجمن ترقی اُردو پاکستان، ڈی-۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال کراچی-۷۵۳۰۰

Regd M. No. 270 Phone: 461406

Monthly

QAUMI ZABAN

Karachi

انجمن کی مجوزہ عمارت کا نقشہ

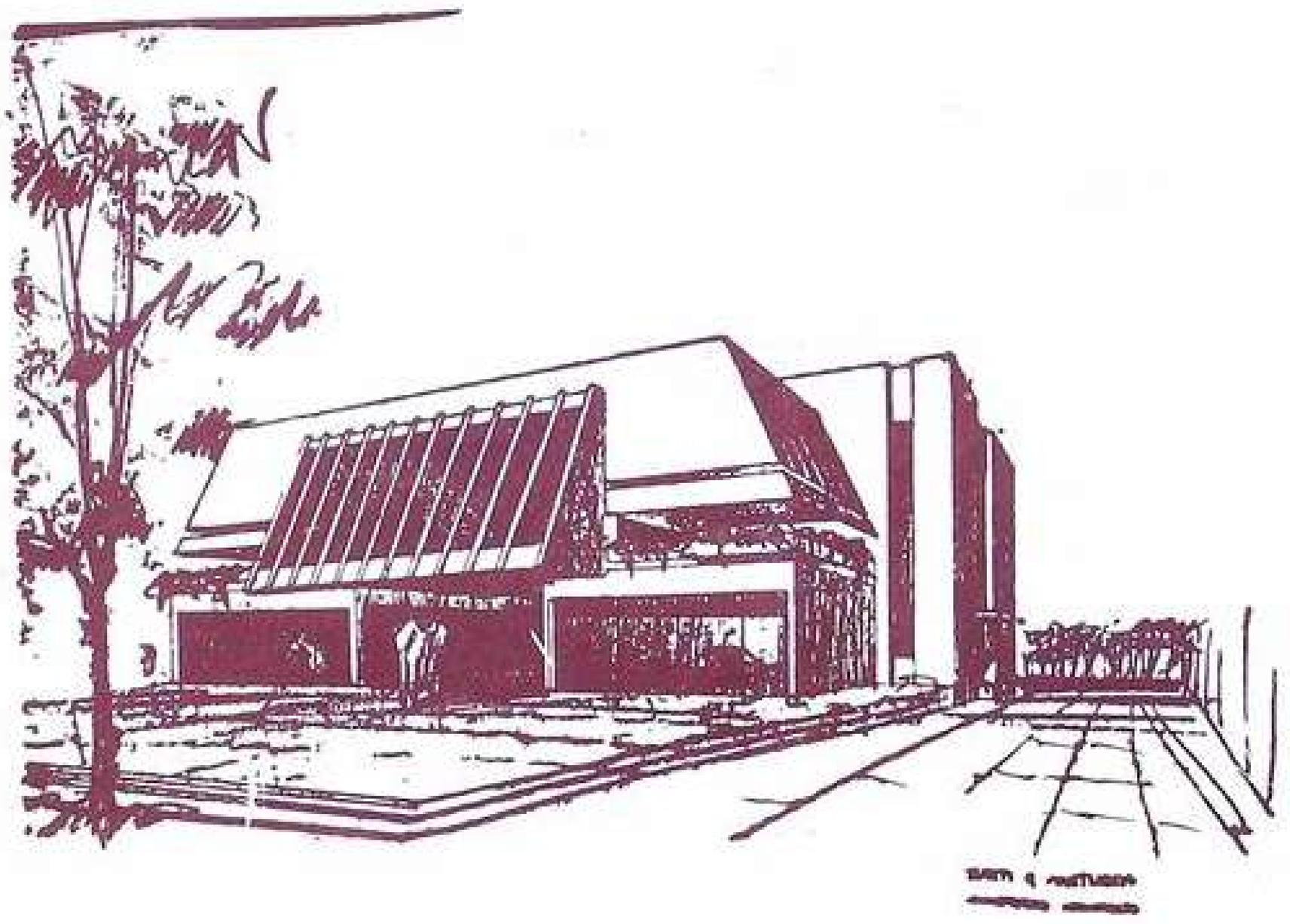

ایک خواب

جسے شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے ہر پاکستانی کے تعاون کی ضرورت ہے

مدیر: ادیب سہیل، طابع: فضلی سنز (پرائیوٹ) لمیٹڈ کراچی مقام اشاعت ڈی ۱۵۹ بلاک (۷) گلشن اقبال کراچی